فہرست مضمون نگارانِ معارف

جلد ۱۰۸

جولائی ۱۹۷۱ء تا دسمبر ۱۹۷۱ء

(بترتیب حروف تہجی)

شمار	اسماء	صفحہ	شمار	اسماء	صفحہ
۱	جناب مولانا قاضی اطہر صاحب مبارکپوری (اڈیٹر البلاغ بمبئی)	۲۵۰	۷	ضیاء الدین اصلاحی رفیق دار المصنفین	۱۸۹-۱۵۵-۷۹ ۲۶۱-۲۳۷ ۳۹۹-۳۱۵ ۴۵۹
۲	جناب ڈاکٹر حامد علی خاں صاحب لکچرر عربی مسلم یونیورسٹی علی گڑھ	۲۰۷	۸	جناب مولوی عبد العظیم صاحب اصلاحی	۱۰۹
			۹	جناب ڈاکٹر شیخ عنایت اللہ صاحب پی، ایچ، ڈی لندن پروفیسر عربی پنجاب یونیورسٹی	۴۲۶-۳۴۲
۳	جناب ڈاکٹر حمید اللہ صاحب پیرس	۱۴۹			
۴	مولانا شبلی رحمۃ اللہ علیہ	۲۲۰			
۵	سید صباح الدین عبد الرحمٰن	۱۹۵-۸۵-۳۰ ۳۷۰-۲۳۰ ۴۵۵	۱۰	جناب حکیم محمد زمان صاحب سیفی حسینی	۱۳۳
			۱۱	شاہ معین الدین احمد ندوی	۲۴۵-۱۶۲-۸۲-۵-۲ ۴۰۷-۳۷۵-۳۲۲
۶	ضیاء الحق ندوی ناظر کتب خانہ دار المصنفین	۱۴۲	۱۲	نعیم صدیقی ندوی رفیق دار المصنفین	۴۰۰-۳۰۵ ۴۴۵-۳۶۳
			۱۳	جناب ڈاکٹر نور السعید اختر ایم اے، پی ایچ ڈی بمبئی	۵۳

فہرست مضامین معارف

جلد ۱۰۸

جولائی سنہ ۱۹۷۱ء تا دسمبر سنہ ۱۹۷۱ء

(بہ ترتیب حروف تہجی)

جلد ۱۰۸۔ ماہ جمادی الاولیٰ ۱۳۹۱ھ مطابق ماہ جولائی ۱۹۷۱ء۔ عدد ۱

مضامین

مقالات

ادبیات

جلد ۱۰۸ - ماہ جمادی الاولیٰ ۱۳۹۱ھ مطابق ماہ جولائی ۱۹۷۱ء - عدد ۱

مضامین

مقالات

ادبیات

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

شذرات

افسوس ہے کہ گذشتہ مہینہ ہندوستان کی دو نامور شخصیتوں سری پرکاش جی اور پروفیسر محمد حبیب نے وفات پائی، سری پرکاش کی شخصیت مختلف حیثیتوں سے بڑی اہم تھی، وہ ہندوستان کے مشہور فلسفی ڈاکٹر بھگوان داس کے فرزند اور پنڈت جواہر لال نہرو کے پرانے معتمد علیہ رفیق تھے، انگلستان کی تعلیم کے زمانہ سے لیکر ہندوستان کی جنگ آزادی اور اسکے بعد تک ہر مرحلہ میں دونوں کا ساتھ رہا، آزادی کے بعد سری پرکاش حکومت کے ذمہ دار عہدوں پر رہے اور بڑی خوبی سے اپنے فرائض انجام دیئے اور اپنے خلاص اور سلامت روی کی بنا پر پاکستان میں بھی ہائی کمشنری کے زمانہ میں مقبول رہے، اور دونوں ملکوں کو قریب لانے کی کوشش کی، وہ ہماری پرانی مشترک تہذیب کی یادگار اور ہندو مسلم اتحاد کے بہت بڑے علمبردار تھے اور آخر تک اس پر قائم رہے، ان کا سب سے بڑا وصف انکی بے تعصبی، فراخدلی اور اخلاقی بلندی تھی، وہ سیاست میں بھی صداقت و اخلاص پر عامل تھے، جو آجکل کے سیاسی لیڈروں میں کمیاب ہے، اس لیے آزادی کے بعد کے حالات سے بہت بددل تھے، عرصہ سے خانہ نشینی اختیار کر لی تھی، لیکن کبھی کبھی اپنے خیالات اخبار کے ذریعہ ظاہر کرتے رہتے تھے، ایک دو مرتبہ پنڈت جواہر لال نہرو کے ساتھ دارالمصنفین بھی آئے تھے، اور یہاں کے بزرگوں سے ان کے تعلقات تھے، وہ جس تہذیب کی پیداوار تھے اس کا دور اب ختم ہوگیا، سری پرکاش اس کی آخری یادگار تھے، اب ایسے نمونے نہ پیدا ہوں گے۔

پروفیسر محمد حبیب ہندوستان کی قرون وسطیٰ کی تاریخ کے نامور مورخ تھے، اور اسکے ماہر جانے جاتے تھے، پوری عمر مسلم یونیورسٹی سے وابستہ رہے، اور شعبۂ تاریخ کی صدارت سے ریٹائر ہوئے، وہ صحیح معنوں میں طالبعلم

تھے، انکی پوری زندگی تعلیم و تدریس اور تالیف و تصنیف میں گذری، اس کا ان کو ایسا چسکا تھا کہ ریٹائر ہونے کے بعد بھی مسلم یونیورسٹی کے طلبہ کی علمی و تعلیمی رہنمائی کرتے رہتے تھے، انھوں نے اسلامی ہند کی تاریخ پر سیکڑوں مضامین لکھے لیکن اس کے بعض پہلوؤں کے متعلق ان کے خیالات دوسرے مسلمان مورخین سے مختلف تھے، اور اس میں اعتدال و توازن نہ تھا جس کا نمونہ ان کی کتاب محمود غزنوی اور ڈاکٹر اطہر عباس رضوی کی کتاب کا مقدمہ ہے جس میں انھوں نے مصنف کو البیرونی، بوعلی سینا، خواجہ نظام الدین اولیاء اور شیخ عبدالحق محدث دہلوی کا ہم پایہ بنا دیا ہے، لیکن اس سے ان کے علمی کمال میں فرق نہیں آتا، وہ عملی سیاست کے آدمی نہیں تھے لیکن خیالات کے لحاظ سے پکے نیشنلسٹ سمجھے جاتے تھے، انکی موت سے ایک نامور مسلمان مورخ اٹھ گیا، اللہ تعالیٰ ان کی لغزشوں سے درگذر کرے، اور ان کی مغفرت فرمائے۔

ہمارے لیے تیسرا حادثہ مولانا سید محمد ہاشم ندوی کی وفات کا ہے، وہ ندوہ کے لائق فرزند تھے جس سال راقم ندوہ میں داخل ہوا ہے، اسی سال وہ فارغ ہوئے تھے، اور حضرت سید صاحب کی سفارش سے اسی زمانہ میں دائرۃ المعارف حیدر آباد میں ملازم ہو گئے تھے جس سے ریٹائر ہونے تک وابستہ رہے، وہ اس کے اہم رکن تھے، بہت سی کتابیں انکے اہتمام میں شائع ہوئیں، بعض کی انھوں نے تصحیح بھی کی اور بعض پر مقدمے لکھے، انھوں نے ایک مفید علمی خدمت یہ انجام دی کہ دنیا کے مختلف کتب خانوں میں عربی کی جو اہم اور نادر و نایاب کتابیں ہیں ان کی فن وار فہرست "تذکرۃ النوادر" کے نام سے مرتب کی جو دائرۃ المعارف سے شائع ہوگئی ہے، ملازمت سے سبکدوش ہونے کے بعد حیدرآباد ہی میں متوطن ہو گئے تھے، ان کی صحت عرصہ سے خراب تھی، گذشتہ مہینہ حیدرآباد کے ایک خط سے معلوم ہوا کہ انکا انتقال ہوگیا، ستر سے کچھ اوپر عمر رہی ہوگی، اللہ تعالیٰ اس خادم علم کو اپنی رحمت و مغفرت سے سرفراز فرمائے۔

وزیر اعظم نے گذشتہ الیکشن میں اردو کے بارہ میں جو وعدے کیے تھے، ان کی ایک تقریر سے معلوم ہوا

کہ اس سلسلہ میں انھوں نے اتر پردیش کی حکومت کو اردو کی تعلیم کی طرف توجہ دلائی ہے، مگر محض اتنا کافی نہیں ہے، اردو کا اصل مطالبہ تو یہ ہے کہ ہندوستان کی ہندی ریاستوں میں اس کو دوسری سرکاری زبان بنایا جائے، اس کے بغیر اس کا پورا حق نہیں مل سکتا، ورنہ کم سے کم تعلیم کے ساتھ عدالتوں اور دوسرے سرکاری محکموں میں اردو میں درخواست دینے کا حق حاصل ہو، اور جو حقوق بھی ملیں اس کو قانونی شکل دی جائے، ورنہ ان پر عمل نہ ہوگا، جس کا تجربہ برسوں سے ہو رہا ہے، اور ان سب کے لیے اردو کی تعلیم ضروری ہے، اس کے بغیر نہ صرف عدالتوں اور سرکاری محکموں میں اردو سمجھنے والے بلکہ شعبۂ تعلیم میں اردو پڑھانے والے تک نہ ملیں گے، اس کی آسان شکل یہی ہے کہ آٹھویں تک اردو کی تعلیم لازمی کردی جائے، اس کے بغیر جو حقوق ملیں گے، ان سے پورا فائدہ حاصل نہ ہوگا۔

یہ تو حکومت کا کام ہے، اردو والوں کا یہ فرض ہے کہ اردو کو جو حقوق بھی ملیں، ان سے پورا فائدہ اٹھائیں، اردو کی بقاء و ترقی کے جو وسائل ہیں ان کو اختیار کریں، اردو کے مکتب قائم کریں، اردو کے اخبارات، رسالوں اور کتابوں سے دلچسپی لیں، ان کی توسیع اشاعت کی کوشش کریں،

اس وقت اردو کی خدمت کا ایک موقع یہ پیدا ہوگیا ہے کہ مرکزی انجمن ترقی اردو کی عمارت دلی میں بننے والی ہے، اس کے مصارف کا تخمینہ پانچ لاکھ ہے، کچھ رقم تو انجمن کے پاس ہے اور کچھ حکومت دے گی، لیکن یہ دونوں عمارت کی تکمیل کے لیے ناکافی ہیں، اس لیے انجمن نے اس کی فراہمی کے لیے مختلف رقموں کی رسیدیں چھپوائی ہیں، اردو والوں کو چاہیے کہ وہ ان رسیدوں کو منگوا کر مطلوبہ رقم فراہم کرنے کی کوشش کریں، اردو کے حامی تو کھیل تماشوں کے لیے ہزاروں روپے جمع کر لیتے ہیں، کیا انجمن اس کی بھی مستحق نہیں ہے۔

مقالات

ارمغانِ سلیمان

از شاہ معین الدین احمد ندوی

مولانا عبدالماجد صاحب دریابادی سید صاحب کے ادبی و شعری ذوق کے بارہ میں لکھتے ہیں:

سید صاحب کے فاضل اجل اور عالم بے بدل ہونے کا ایک زمانہ قائل ہے، دنیا کو تسلیم ہے کہ فنِ تاریخ کے امام وقت تھے، اور سیرت نگاری میں اپنی نظیر آپ، لیکن آخر دم تک کم ہی لوگوں نے ان کے ادبی، شعری اور تنقیدی مرتبہ کو جانا اور کمتر ہی لوگوں نے انھیں ادیب، انشا پرداز اور سخن سنج کی حیثیت سے پہچانا، علم و ادب کی تاریخ میں ایسی ناشناسی اور کم شناسی کی مثالیں نہ معدوم ہیں نہ غیر معلوم"۔

سید صاحب کے علمی اور تصنیفی کارناموں پر تو بہت کچھ لکھا جا چکا ہے اور آئندہ بھی لکھا جائے گا، لیکن ان کی شاعری کی طرف کسی نے توجہ نہیں کی، ان کے داماد سید حسین صاحب نے سلیمان نمبر میں حضرت قبلہ کا عارفانہ کلام" کے عنوان سے ایک مختصر مضمون لکھا تھا، اور ان کے مجموعۂ کلام "ارمغانِ سلیمان" کے دیباچہ میں اس کے مرتب غلام محمد صاحب نے انکی شاعری پر مختصر تبصرہ کیا ہے، لیکن یہ دونوں مضامین ان کے مرتبۂ شاعری کو سمجھنے کے لیے ناکافی ہیں، ان سے صرف اس کی ایک جھلک نظر آتی ہے، اس لیے مناسب معلوم ہوا کہ ان کے

کمال کا یہ رخ بھی پیش کر دیا جائے۔

شعر و شاعری سے اُن کے ذوق کی بنیاد ابتدائی تعلیم ہی کے زمانہ میں بیت بازی سے پڑی تھی، ان کے بھتیجے مولانا ابوظفر صاحب مرحوم لکھتے ہیں:

ان مکاتب میں بیت بازی بھی ہوتی تھی، کبھی ایک ہی مکتب کے طلبہ دو جماعتوں میں تقسیم ہو کر بیت بازی کرتے تھے، اور کبھی دو مکتبوں کا ایک دوسرے سے مقابلہ ہوتا تھا، علامہ سید سلیمان ندوی کے مکتب میں بھی دو پارٹیاں تھیں، جہاں تک مجھے یاد ہے ایک پارٹی کے امیر علامۂ موصوف اور ان کے مشیر خاص مولوی حکیم سید نجم الہدیٰ صاحب ندوی تھے، اور دوسری کے مولوی محمد قاسم صاحب، یہ دونوں آج بھی بقید حیات ہیں، اس کا بڑا فائدہ یہ ہوا کہ علامۂ موصوف کو شاعری سے ایک خاص لگاؤ ہو گیا، اور ہزاروں اشعار ان کو زبانی یاد ہو گئے۔

اس سلسلہ میں علامۂ موصوف نے ایک بیاض تیار کی تھی جس کے سرورق کو رنگ سے خوشنما بنا دیا تھا، اس میں ہزاروں منتخب اشعار درج تھے، میرے والد مرحوم کی وفات ۱۹۲۹ء تک میرے ذاتی کتب خانے میں یہ بیاض موجود تھی، چونکہ بیت بازی کے حریف خود ساختہ اشعار بھی پیش کرتے تھے، اس لیے علامۂ موصوف کو تقطیع کی طرف خاص توجہ کرنا پڑی جس سے انکو فن عروض میں اتنا عبور ہو گیا تھا کہ علماء میں اسکی مثالیں کم ملیں گی۔" (معارف سلیمان نمبر)

ابتدائی تعلیم کے بعد وہ عربی کی تعلیم کے لیے پھلواری بھیجے گئے، یہاں خانقاہ کی قوالی کے اثر سے شعر و شاعری کا بڑا چرچا تھا، سید صاحب کو اس کا چسکا بیت بازی سے پڑ چکا تھا، قوالی کی محفلوں نے اس کا ذوق اور بڑھا دیا، وہ خود لکھتے ہیں:

"یہاں (پھلواری) خانقاہ میں ہر ہفتہ قوالی ہوتی تھی، اس کے اثر سے شعر و شاعری

کا خاصہ چرچا تھا، اس فضا میں میں نے سانس لی، اور یہیں سب سے پہلے مولوی عبدالحلیم شرر کا ناول منصور موہنا پڑھا، اور جب کتاب ختم کی تو خوب پھوٹ پھوٹ کر رویا۔" (معارف جولائی ۱۹۴۶ء)

اس کے بعد وہ مزید تعلیم کے لیے دار العلوم ندوۃ العلماء میں داخل ہوئے، اس زمانہ میں لکھنؤ کی پوری فضا پر شعر و شاعری چھائی ہوئی تھی، ہر طرف امیر و جلال کے نغمے گونج رہے تھے اور آئے دن مشاعرے ہوتے رہتے تھے، اس فضا نے شاعری کا نشہ اور تیز کر دیا، مولانا عبدالماجد صاحب لکھتے ہیں:-

آخر زمانہ میں تو ان کا مطالعہ یوں بھی بہت گھٹ گیا تھا، بلکہ کہنا چاہیے کہ سمٹ سمٹا کر صرف دینیات تک محدود ہو کر رہ گیا تھا لیکن جن دنوں ذوق مطالعہ جوان تھا اور سن بھی جوانی کے تھے، تو اردو کی غزلیات کیا معنی ہزلیات تک کا دفتر بے معنی و با معنی ان کی انگلیوں کی نوک پر تھا، کلیات پر کلیات ختم کر دیے اور گلدستہ کا تو اب لفظ بھی تشریح طلب ہو گیا ہے، (اپنے زمانہ میں تازہ غزلوں کے ماہنامے کو کہتے تھے) ایک زمانہ میں ان گلدستوں کی بہار تھی، لکھنؤ تو پھر بھی لکھنؤ ہے، اور شہروں بلکہ قصبوں تک میں ان کے ورق ورقِ گل کی طرح پھیلے ہوئے تھے، اور سید صاحب تھے کہ ان خوشبوؤں میں بسے ہوئے تھے، سید صاحب کا وطن پٹنہ خود ہی اردو شعر و سخن کے حق میں گلزار اور پھر سید کا لکھنؤ کا سالہا سال کا قیام، جو کور کسر رہ گئی تھی وہ پوری ہو گئی اور سید صاحب اس چمن کے ایک خوشنوا بلبل بن گئے (معارف سلیمان نمبر)

لکھنؤ کی اس شعر پرور فضا نے سید صاحب کو پورا شاعر بنا دیا، وہ خود بھی شعر کہنے لگے، کبھی کبھی مشاعروں میں بھی شرکت کرتے تھے، مولانا ابوظفر صاحب لکھتے ہیں:-

شاعری کا نشہ لکھنؤ آکر اور تیز ہو گیا، ندوہ کے طلبہ میں مولوی رکن الدین دانا سہسرامی،

سید عبد الغفور شہرہ، مولانا فاروق صاحب چریاکوٹی کے صاحبزادے مولوی مبین وغیرہ شاعری کرتے تھے، اس زمانہ کے اساتذہ میں داغ، امیر، جلال، ریاض، مضطر وغیرہ بقید حیات تھے، لکھنؤ میں گذشتہ ادبی سرگرمیاں موجود تھیں، "پیام یار" نامی رسالہ طرحی اور غیر طرحی غزلوں کے ساتھ ہر ماہ نکلتا تھا، شہر میں مجلسیں اور مشاعرے بکثرت ہوتے تھے، علامۂ موصوف ان مشاعروں میں اکثر شرکت کرتے تھے، آخر میں خود بھی شعر کہنے لگے تھے، اور انھیں اپنے احباب خاص طور سے مولوی صدیق حسن اور عثمان پاشا کو سناتے تھے۔ وہ اکثر مشاعروں میں بھی شریک ہوتے تھے، اور غزل بھی سناتے تھے، ایک مرتبہ ایک مشاعرے کی خبر شام کو ملی، رات کو مشاعرہ تھا، غزل کہنے کی کوشش کی، اور صرف ایک شعر کہنے پائے تھے کہ احباب آگئے، اور ان کے ساتھ چل پڑے،...... ان کی صورت شکل اور لباس دیکھکر شمع ان کے سامنے بھی آئی، پہلے تو بہت پریشان ہوئے، لیکن انتقال ذہن نے پریشانی دور کردی، انھوں نے معذرت کی کہ مجھے مشاعرے کی مطلق خبر نہ تھی، ابھی احباب نے اطلاع دی، فوراً اٹھا اور چلا آیا، اس لیے صرف ایک شعر ذہن میں آیا ہے، وہ عرض کرتا ہوں:

سر سے قدم تلک ہے ردائے حیا پڑی	حاجت ہی کیا ہے آپ کو صاحب حجاب کی

شعر لکھنؤ کے رنگ کا تھا، خوب داد ملی۔ (معارف سلیمان نمبر)

اس زمانہ میں داغ اور امیر کا رنگ چھایا ہوا تھا، سید صاحب امیر کے زیادہ قائل تھے، ان کے دواوین ان کے مطالعہ میں رہتے تھے، مولانا عبد الماجد صاحب دریا بادی انکی فن دانی اور تحقیق لغت کے تو معترف تھے مگر ان کی غزل گوئی کے قائل نہ تھے، اس بارہ میں انھوں نے اپنا اور سید صاحب کا ایک مکالمہ نقل کیا ہے:

سید صاحب۔ تو یہ کہئے آپ امیر مینائی کی غزل گوئی کے قائل نہیں، صرف ان کی فن دانی اور تحقیق لغت و زبان کے قائل ہیں، اچھا ایک شعر سناتا ہوں...... بتائیے کیسا ہے؟

مولانا عبد الماجد۔ بہت اچھا ہے۔

سید صاحب۔ اور یہ شعر......

مولانا عبد الماجد۔ یہ بھی خوب ہے سبحان اللہ۔

سید صاحب۔ اچھا اور یہ...... اور یہ...... اب کہاں تک سنیے گا یہ سارے شعر امیر ہی کے تھے، اس لیے سید صاحب کا ابتدائی کلام بھی اسی رنگ کا ہے، اس کا نمونہ یہ ہے:

دست نازک سے اٹھاتے ہیں وہ میت میری	بعد مدت کے ٹھکانے لگی محنت میری
بجلی کی طرح قبر پہ آئے چلے گئے	
اب تک ہمارے دل کو وہ تڑپائے جاتے ہیں	
پہلے تو چھیڑتے تھے تصور میں بار بار	اب کیوں شب وصال وہ شرمائے جاتے ہیں
ادھر گلچیں خفا ہے اور ادھر بیتاب ہے بجلی	خدا حافظ ہے اے بلبل ترے اب آشیانے کا

یہ اشعار طالب علمی کے زمانہ کے ہیں، دوسرا دور قیام دار المصنفین کے بعد سے شروع ہوتا ہے اس زمانہ میں مولوی اقبال احمد خاں صاحب سہیل اور مرزا احسان احمد صاحب کی نوا سنجیوں سے اعظم گڈھ میں شعر و شاعری کا بڑا چرچا تھا، اس لیے یہاں بھی شاعرانہ ماحول ملا، پھر آگے چل کر دار المصنفین خود ایک بڑا ادبی مرکز بن گیا، اور اس عہد کے بہت سے شعراء کا تعارف معارف کے ذریعہ ہوا، جگر مراد آبادی کی شہرت کا آغاز بھی یہیں اعظم گڈھ سے ہوا، وہ اس زمانہ میں چشمہ کے ایجنٹ تھے، اس سلسلہ میں جب اعظم گڈھ آنا ہوتا تو مرزا احسان احمد صاحب

کے یہاں ٹھہرتے تھے، اور شعر و شاعری کی محفلیں جمتی تھیں، ان کے کلام کا پہلا مجموعہ داغ جگر مرزا احسان صاحب نے مرتب کیا تھا، جو معارف پریس میں چھپا تھا، اس پر ان کا مقدمہ بھی ہے، اسی سے جگر صاحب کی شہرت کا آغاز ہوا، ان کے دوسرے مجموعۂ کلام شعلۂ طور پر سید صاحب نے مقدمہ لکھا تھا، جو لطافت و شعریت میں جگر صاحب کی شاعری کا جواب ہے، اصغر گونڈوی کا مجموعۂ کلام نشاط روح معارف پریس میں چھپا، اس پر سہیل صاحب کا مبسوط مقدمہ ہے، جو بجائے خود ایک ادبی شاہکار ہے، مولانا عبد السلام ندوی خود شاعر اور نقاد سخن تھے، اُن کا خاص موضوع تنقید شعر و ادب تھا، انھوں نے شعر الہند لکھی جن کا ادبی اور شعری ذوق بنانے میں بڑا حصہ ہے، اور بکثرت ادبی و تنقیدی مضامین لکھے جس کا مجموعہ بھی شائع ہو چکا ہے، دار المصنفین نے مولانا حکیم عبد الحیٔ صاحب کی کتاب گل رعنا شائع کی، اردو زبان و ادب کی تاریخ و تنقید پر سید صاحب کے فاضلانہ مقالات اور تقریروں کا مجموعہ نقوش سلیمانی کے نام سے چھپ گیا ہے، راقم نے اس دور کے بہت سے ممتاز شعراء اصغر، جگر، فانی، ریاض خیرآبادی، جوش ملیح آبادی، خواجہ عزیز الحسن مجذوب اور حضرت سہیل کے کلام پر مبسوط تنقیدی مضامین اور متعدد شعراء کے دواوین پر مقدمے لکھے، جن کا مجموعہ نقوش ادب کے نام سے شائع ہو چکا ہے، سید صباح الدین عبد الرحمٰن نے ہندوستان کے قرون وسطیٰ کی فارسی شاعری کی پوری تاریخ لکھی ہے، جس کی کئی جلدیں چھپ چکی ہیں، اور بہت مقبول ہوئیں، دار المصنفین کے ان کارناموں نے اس کو علمی مرکز کے ساتھ ایک بڑا ادبی مرکز بھی بنا دیا۔

اس زمانہ میں کبھی کبھی یوں بھی مشاعرے ہوا کرتے تھے، جگر صاحب کی آمد پر خصوصیت کے ساتھ بزم مشاعرہ گرم ہوتی تھی، اس میں سید صاحب بھی شرکت فرماتے تھے، اور کبھی کبھی غزل بھی پڑھتے تھے، اور مولانا عبد السلام تو پابندی سے کہتے تھے، ان کی بیشتر غزلیں ان ہی مشاعروں

کی یادگار ہیں،

سید صاحب کی شاعری کا دوسرا دور جو قیام دار المصنفین کے بعد سے شروع ہوا، مولانا اشرف علی صاحب کی ارادت یعنی ۱۹۴۳ء تک قائم رہا، اس دور کے کلام میں نمایاں تبدیلی نظر آتی ہے، اب ان کی شاعری محض گل و بلبل اور ہجر و وصال کی داستان نہیں رہ گئی، انکے جذبات میں لطافت اور خیالات میں معنویت اور گہرائی پیدا ہو گئی، اس دور کا نمونۂ کلام یہ ہے:

ہے کائنات کا ہر ایک ذرہ گردش میں پتہ جو چل نہ سکا تیری جستجو میں ہے

دہن میں تیغ کے اب بھی ہے تشنگی باقی عجیب لذتِ پنہاں مرے لہو میں ہے

نگاہ لطف ادھر ہو کہ آ چلا ہے کیف بچا نہ رکھ مرے ساقی جو کچھ سبو میں ہے

اس کا بیت الغزل یہ شعر ہے:

ہزار بار مجھے لے گیا ہے مقتل میں وہ ایک قطرۂ خوں جو رگ گلو میں ہے

مولانا محمد علی مرحوم کی ایک مشہور غزل ہے، جس کا مطلع ہے:

ہر رنگ میں راضی بہ رضا ہو تو مزا دیکھ دنیا ہی میں بیٹھے ہوئے جنت کی فضا دیکھ

اسی زمین میں سید صاحب اور مولانا عبد الماجد صاحب نے بھی غزلیں کہیں، سید صاحب کی غزل کے چند اشعار یہ ہیں:

تشہیر کا باعث ہو نہ دامانِ قبا دیکھ لائے نہ کہیں رنگ یہ خونِ شہدا دیکھ

یہ عالمِ امکاں ہے تماشا گہِ قدرت جو کچھ تجھے دکھلائے یہاں دستِ قضا دیکھ

تاثیر وفا وعدۂ باطل ہے سراسر اب شوخ ستم گار یہ کچھ کر کے جفا دیکھ

انکار تھا تجھکو مری تاثیر دعا سے اب میری طرف دیکھ تو تاثیر دعا دیکھ

آزاد مکاں سے ہوا سے قید مکاں کیا گر آنکھ ہے بتخانہ میں بھی نورِ خدا دیکھ

نکلے گا وہ خورشید جمال آج ادھر سے | اڑ جائیں میری خاک کے ذرے نہ صبا دیکھ
مقبول ہوئے یوسفِ[1] زنداں مرا تحفہ | لایا ہے جو پیغامبر[2] ملکِ سبا دیکھ

مولانا عبد الماجد صاحب کی غزل

رفتارِ فلک دیکھ زمانہ کی ہوا دیکھ | اے کورِ بصر دہر کا انجام ذرا دیکھ
ہر شے سے ٹپکتا ہے مرا جذبِ تمنا | نالہ کا اثر دیکھ کہ تاثیرِ دعا دیکھ
آشفتہ سری پر مری کیوں طنز ہوا اتنا | تو خود بھی ذرا اب یہی زلف دوتا دیکھ
لازم ہے کبھی دلدہی ان کی بھی ستم گر | ٹوٹے نہ کہیں ہمتِ اربابِ وفا دیکھ
خودداری و تقویٰ پہ یہ کیوں ناز ہے زاہد | ناظر کو در بت پہ کبھی ناصیہ سا دیکھ

اس غزل سے اندازہ ہوتا ہے کہ اگر مولانا نے شاعری کا کوچہ نہ چھوڑ دیا ہوتا تو اس میدان میں بھی ان کا قدم کسی سے پیچھے نہ رہتا، مگر ان کے صحیفۂ ادب نے صحیفۂ شاعری کو منسوخ کر دیا، پھر بھی ان کا شعری ذوق اتنا بلند ہے کہ وہ اشعار کو نثر میں نگینہ کی طرح جڑ دیتے ہیں،

اس زمانہ میں سید صاحب نے ایک نظم نما غزل "اخفائے محبت" کے عنوان سے کہی ہے جو خیالات کی رفعت و پاکیزگی کے لحاظ سے پڑھنے کے لائق ہے، اس کے کچھ اشعار ملاحظہ ہوں:

یہ کیسی بیکسی ضبطِ محبت میں الٰہی ہے | کہ اسکا نام بھی میری زباں پر آ نہیں سکتا
لب خاموش بھی بیگانۂ رازِ درونی ہے | کوئی حرف اس تمنا کا لبوں پر آ نہیں سکتا
بشکلِ نالہ اسکو بند ہو کر دل میں رہنا ہے | میں اس بوئے محبت کو کبھی پھیلا نہیں سکتا
نظر اپنی سرِ بزم انکی جانب اٹھ نہیں سکتی | کہ اسرارِ دروں میں برملا بتلا نہیں سکتا

[1] یہ مولانا محمد علی کی طرف اشارہ ہے جو اس زمانہ میں جیل میں تھے [2] یعنی سلیمان

جو تنہائی بھی حاصل ہو تو لب کچھ کہہ نہیں سکتے | کہ صورت دل کی خلوت میں بھی بن کھلا نہیں سکتا
اس اخفائے محبت میں جو لطفِ روح پرور ہے | کسی صورت میں وہ ضبطِ بیاں میں آ نہیں سکتا

اس دور کے کلام کا نمونہ یہ ہے:

نازک بہت ہے عشق و محبت کا آئینہ | سایہ پڑے بھی غیر کا اس پر تو ٹوٹ جائے
یہ آبگینے مجھکو نہایت عزیز ہیں | اے خارِ دشت آبلہ کوئی نہ پھوٹ جائے

یہ کیسی آگ ہے سینہ میں دب دب کر سلگتی ہے | ذرا دامن سے دی تم نے ہوا اور دل میں لگتی ہے
نہ بجھ جانے کی رخصت ہے نہ جل جانے کی ہمت ہے | سلگ کر پھر وہ بجھتی ہے وہ بجھ کر پھر سلگتی ہے

یہ دل وہ شیشۂ نازک ہے میرے سینہ میں | نظر سے بھی جو گرے پاش پاش ہو جائے
نگاہِ شوق ذرا دیکھ بھال کر اٹھے | چھپا ہے راز جو دل میں نہ فاش ہو جائے
شکستِ رونقِ بتخانہ ہو نہیں سکتی | خلیل خود ہی اگر بت تراش ہو جائے

یہ رنگ اگرچہ پہلے رنگ کے مقابلہ میں بہت ستھرا ہے، لیکن سید صاحب کا شہباز علم اس سے بلند آشیانہ کا طالب تھا، اس لیے رفتہ رفتہ اس میں بڑا تغیر بلکہ انقلاب آگیا اور انکا کلام درمیانی عبوری دور کو طے کر کے شاعری کے سدرۃ المنتہیٰ تک پہنچ گیا، اس وقت ان کی شاعری تمامتر دل کی آواز بن گئی، وہ خود فرماتے ہیں:

دامن کو آنسوؤں سے جو نم کر رہا ہوں میں | شرحِ غمِ فراق رقم کر رہا ہوں میں
جو شعر بھی سپردِ قلم کر رہا ہوں میں | سب وارداتِ عشق رقم کر رہا ہوں میں

مولانا روم کی زبان میں

سینہ خواہم شرحہ شرحہ از فراق | تا بگویم شرحِ دردِ اشتیاق

ایک دوسرے شعر میں فرماتے ہیں:

شعلے اٹھیں ہزار تجلی مگر کہاں
یہ آگ ہے ضرور مگر طور کی نہیں
سمجھیں مرے کلام کو جو ہوشمند ہیں
مستی مری یہ بادۂ انگور کی نہیں

اس دور کا کلام تمامتر قلبی واردات کا ترجمان اور بادۂ عرفان کا چھلکتا ہوا جام ہے، آخری دور کے کلام میں کوہ طور کی تجلیاں اور وادی ایمن کی شرربازیاں نظر آتی ہیں، یہ دور حضرت مولانا اشرف علی سے ارادت سے کچھ پہلے شروع ہوتا ہے، اور وارادات پر کمال کو پہنچتا ہے، اس میں راہ سلوک و معرفت کے ہر مرحلے کے نشانات ملتے ہیں، ابتدائی دور کی خلش و تپش، اضطراب و بےچینی، حیرانی و سراسیمگی اور طلب و تمنا کے کوائف ملاحظہ ہوں:

بت پرستی بھی کروں اور بت شکن بھی میں بنوں
کیشِ ابراہیم رکھ کر پیشۂ آذر کروں
دل میں بتخانہ بسا ہے آنکھ ہے کعبہ کی سمت
حیف اس مومن نما کافر کو گر رہبر کروں
کفر پر ہے دل کبھی مائل کبھی اسلام پر
معرکہ اس نور و ظلمت کا میں کیسے سر کروں
آنکھ میں توبہ کے آنسو دل میں اس بت کی ہوس
ہائے گنگا جل کو کیسے کوثر و زمزم کروں

یہ نغمہ ایک دوسری غزل میں اس سے زیادہ پرسوز ہوتا ہے، ایک طالب صادق کس کس عنوان سے اصلاحِ حال کی التجا کرتا ہے:

زبان تسبیح میں شاغل دل اس کی یاد سے غافل
لبوں پر ذکر حق جاری مگر ساکت زبانِ دل
زبان تہلیل سے تر ہے خیالوں میں پھنسا ہے دل
نہ کھل جائے کہیں یارب یہ اسرار نہانِ دل
زباں تاثیر کی طالب ہے دل تاثیر سے خالی
زباں میں ہو نہ دل شامل نہ دل میں ہو زبانِ دل
خدا جانے کہاں دل ہو کہاں پر اس کی منزل ہو
نہیں ملتا سراغِ دل، نہیں ملتا نشانِ دل
کوئی چوٹ ایسی لگ جائے الٰہی میرے سینہ میں
کہ فوارہ سا بن جائے یہ زخم خوں چکانِ دل

اگر ساقی تری چشم فسوں گر کام کر جائے
بدل جائے نظامِ دل، بدل جائے جہانِ دل
کشائش ہائے زنگا رنگ سے چھوٹوں قرار آئے
مقیم اس گھر میں ہو جائے اگر یہ مہمانِ دل
دو راہے خرد کے جب سے آیا ہوں رہِ دل پر
یقیں کی شکل بنتا جا رہا ہے ہر گمانِ دل

یہ پرسوز صدا ایک غزل میں اور زیادہ دل گداز بن جاتی ہے:

صدق احساس کی دولت مرے مولی دیدے
غم امروز بھلا دے غم فردا دیدے
دھن کچھ ایسی ہو فراموش ہو اپنی ہستی
دل دیوانہ و سودائی و شیدا دیدے
اپنے میخانہ سے اور دست کرم سے اپنے
دونوں ہاتھوں میں مرے ساغر و مینا دیدے
کھول دے میرے لیے علم حقیقت کے در
دلِ دانا دلِ بینا دلِ شنوا دیدے
دلِ بیتاب لے دیدۂ پر آب لے
تپ آتش مجھے دیدے نم دریا دیدے
درد دل سینہ میں رہ رہ کے ٹھہر جاتا ہے
جو نہ ٹھہرے مجھے وہ درد خدایا دیدے

طلب صادق اپنا اثر دکھاتی ہے، التجا قبول ہوتی ہے، اور اس کے آثار ظاہر ہونے لگتے ہیں۔

اے خوشا جذب محبت اے خوشا تاثیر عشق
گاہے گاہے ان کو میری یاد آنے لگی
نامۂ عرض محبت شوق سے پڑھنے لگے
خط سے کیا دل کے دھڑکنے کی صدا آنے لگی
میری وارستہ مزاجی مدح کے قابل ہوئی
اب مرے جوش جنوں کی بھی ادا بھانے لگی
نغمۂ اللہ سے طبع حزیں موزوں ہوئی
جو کبھی گاتی نہ تھی اب وجد میں گانے لگی

تصور میں کیا کیا عنایت ہے ان کی
مرے گھر میں آئے ہیں مہمان ہو کر
ستم بھی کرم ہے کہ شور محبت
مزا دے رہا ہے نمکدان ہو کر

جہاں کو معطر بنائے ہوئے ہے
وہ زلفِ معنبر پریشان ہوکر

یہ کس میکدے سے اٹھی موج مے ہے
چلی آرہی ہے جو فیضان ہوکر

حضرت سید صاحب کو خوش قسمتی سے علم و معرفت دونوں راہوں میں ایسے کامل شیوخ ملے جن کی توجہ نے دونوں میں کامل بنادیا، ایک نے ان کو اپنی علمی جانشینی کا منصب عطا کیا، دوسرے نے روحانی خلافت سے سرفراز فرمایا۔

ایک طرف حضرت تھانوی جیسے شیخ کو سید صاحب جیسے شہباز علم کی ارادت پر ناز تھا تو دوسری طرف عقیدت کیش مرید نے باہمہ جلالتِ علم اپنے کو شیخ میں فنا اور اپنی ساری خواہشات اور مرضیات اور افکار و تصورات کو مرشد کے تابع کردیا تھا۔

حاصلِ عمر نثارِ رہ یارے کردم
شادم از زندگیِ خویش کہ کارے کردم

انہی کی ذات ان کا کعبۂ مقصود...... بن گئی تھی، مرشد و مسترشد کے اس تعلق اور اس کے اثرات و نتائج کے بڑے موثر مرقعے سید صاحب کے کلام میں ملتے ہیں:

اس زمانہ میں ان کے قلب پر فیضان کی اتنی بارش تھی کہ شاعری کا فوارہ پھوٹتا تھا۔ اس میں قلبی واردات و کوائف کا ایک عالم نظر آتا ہے، جن کی نزاکت شرح و بیان کی متحمل نہیں، اس لیے بغیر کسی شرح کے اسکے کچھ مرقعے پیش کیے جاتے ہیں۔

فنا فی الشیخ

جس دن سے میرے دل میں تری یاد بسی ہے
ہر ایک کو میں تیرے سوا بھول گیا ہوں

آتا ہے خدا بھی ترے صدقے میں مجھے یاد
گویا کہ بظاہر میں خدا بھول گیا ہوں

عالم کے تماشے نہیں اب جاذبِ دل ہیں
ہر لذتِ ہستی کا مزا بھول گیا ہوں

ہر سمت نظر آتے ہیں ہر وقت وہ مجھ کو
دوریِ مسافت کا گلہ بھول گیا ہوں

منظور تری چشمِ رضا جب سے ہوئی ہے
امید جزا خوفِ سزا بھول گیا ہوں

اے رہبرِ توفیق مجھے راہ بتا دے
نقشِ قدمِ راہنما بھول گیا ہوں

الٹا ہے ورق آج سے افسانۂ نو کا
افسانۂ پارینہ دلا بھول گیا ہوں

پیر میخانہ کی محفل اور چشم ساقی کے اثرات و کوائف کے اتنے دلکش مرقعے ہیں کہ سمجھ میں نہیں آتا کہ کس کو لیا جائے اور کس کو چھوڑا جائے، کچھ مرقعے ملاحظہ ہوں۔

ذرہ ذرہ عالمِ محسوس کا خاموش ہے
یار ہے گرمِ سخن محفل سراپا گوش ہے

چشمِ ساقی میں بھرا کیا بادۂ سرجوش ہے
جس طرف آنکھ اٹھ گئی وہ مستِ بیہوش ہے

حبذا پیرِ مغاں دریا دل و دریا نوال
جمع ہیں میخوار میخانے میں نوشا نوش ہے

تیرے میخواروں کے ساقی کچھ عجب انداز ہیں
دل سراپا جوش ہے لیکن زباں خاموش ہے

اک نظر میں کچھ سے کچھ ہے میری دنیائے حواس
ہوش تھا جو بیہشی ہے بیہشی اب ہوش ہے

اس کا دوسرا منظر

ہر چیز میں جس کی ہے کیفیتِ مستانہ
آباد رہے یا رب تا حشر یہ میخانہ

چھائی ہے یہاں مستی ہر ایک نمازی پر
حیرت ہے یہ گھر اے دل مسجد ہے کہ میخانہ

زاہد نے کہاں پائی زاہد نے کہاں پی لی
گفتار ہے رندانہ رفتار ہے مستانہ

دستارِ فضیلت ہو یا دلقِ مرقع ہو
ہونا ہے لیے اک دن نذرِ مے و میخانہ

وہ چشمِ محبت تو جویائے محبت ہے
دیکھے تو ذرا کرکے اس سے کوئی یارانہ

حاصل رہے کیفیت ہر وقت حضوری کی
آ دل میں مرے چھپ جا اے صورتِ جانانہ

تیسری تصویر

کیا بھری تاثیر ہیں مطرب تری آواز ہو
جو تری محفل میں بیٹھا وہ سراپا ساز ہے

باغ میں صحرا نظر آتا ہو اور صحرا میں باغ
اب مرے جوشِ جنوں کا اور ہی انداز ہے

نام ان کا ہر نفس میں لب پہ یوں آیا کیا
تن میں جیسے روحِ بسمل مائلِ پرواز ہے

دیکھئے ملتی ہے کب دولت سکونِ عشق کی
ہائے ہوے وجوش تو ہنگامہ آغاز ہے

گاہ دیکھا تھا مری چشمِ تصور نے تمہیں
اب وہی تصویر میری ہمدم و دمساز ہے

شیخ کے فیضان سے دنیائے دل بدل جاتی ہے، اضطراب کی جگہ سکون، شک و تذبذب کی جگہ اذعان و یقین پیدا ہو جاتا اور دل انوار و تجلیات سے معمور ہو جاتا ہے،

اے مسیحِ درد دل چارہ گرِ آزار دل
پا رہا ہے تیرے درماں سے شفا بیمار دل

دور باش افکار باطل، دور باش اغیار دل
سج رہا ہے شاہِ خوباں کیلئے دربار دل

تیرے اک چھینٹے سے اے ابر بہاری ان دنوں
سبز ہے شاداب ہے سیراب ہے گلزار دل

دور ہوتی جا رہی ہے ہر کھٹک جو دل میں تھی
تیرے سوزن سے نکلتے جا رہے ہیں خار دل

ہوش ہے گرمی و مستی ہے وفورِ شوق ہے
شکر ہے رونق پہ ہے امروز کاروبار دل

المدد توفیق ضبط و المدد تاب سکوت
لب پہ لے آئے نہ جوشِ دل کہیں اسرار دل

قلبِ عاشق بھی ہو پھر ہم پایۂ عرش بریں
جلوہ فرما مسندِ دل پر اگر ہو یارِ دل

فخر تو اس رشتۂ تسبیح پر فرمانہ شیخ
دل کی رگ رگ سے تو پہلے کھینچ لے زنار دل

اس کیفیت کی دوسری تصویر

ساز گار اب گردشِ ایام ہے
دور میں ہشتاد سالہ جام ہے

لذتِ خلوت بیاں کیا کیجئے
ایک میں ہوں ایک انکا نام ہے

دل ہو اے ناداں تجلی گاہِ دوست
کیوں نگاہِ شوق سوے بام ہے

تیرے یاد آنے سے ہر غم مٹ گیا
وارد ہے ہر درد تیرا نام ہے

نام لیتے ہی نشہ سا چھا گیا
ذکر میں تاثیر دورِ جام ہے

اس کی دزدیدہ نگاہی کے نثار
آج ہی آغاز کا انجام ہے

تھی جو آزادی تو ہر سو دوڑ تھی
قید میں آرام ہی آرام ہے

اب درِ پیرِ مغاں چھوٹے نہیں
اس کی مٹی میں بھی کیف جام ہے

فیض ہے یہ کس ولی وقت کا
اب مرا شعر ہے الہام کہ

اس راہ میں سب سے بڑی دولت محبت ہے،

اس فقر میں بھی عاشق کیا صاحبِ دولت ہے
اک ذرہ محبت کا کونین کی دولت ہو

اک غم نے بنایا ہے ہر غم سے مجھے فارغ
اندوہِ محبت بھی گنجینۂ حسرت ہے

آباد ہے اک عالم ہر گوشۂ خاطر میں
دنیائے محبت میں افلاک کی وسعت ہے

اک گھونٹ میں بھلا ہے میخوار دو عالم کو
کیا تند نشہ تیرا اے جامِ محبت ہے

ترے نام ہی میں حلاوت ملے
جو ذوقِ محبت کی دولت ملے

ترے عشق کے غم کی دولت ملے
تو سارے غموں سے فراغت ملے

محبت تو اے دل بڑی بات ہے
یہ کیا کم ہے اس کی جو حسرت ملے

یہی زندگی جاودانی بنے
جو آبِ حیاتِ محبت ملے

آخری منزل عرفانِ حق

ذکرِ حق سے صیقلِ کامل ہوا　　محوِ دل سے نقش ہر باطل ہوا

چار جانب بارشِ انوار ہے　　جلوہ فرما وہ مہِ کامل ہوا

قیل و قالِ مدرسہ کو چھوڑ کر　　شیخ بھی رندوں میں اب شامل ہوا

آج ہی پایا مزا ایمان کا　　جیسے قرآن آج ہی نازل ہوا

ایسے کچھ انداز سے تقریر کی　　پھر نہ پیدا شبہہ باطل ہوا

بزم میں دیکھا کیے اس ناز سے　　جس طرف دیکھا نشانہ دل ہوا

دیکھکر سب کو اس کو چن لیا

جو نگاہِ ناز کے قابل ہوا

اس مقام پر پہنچ کر لا الٰہ الا اللہ کی حقیقت منکشف ہوتی ہے، اور ہر موئے بدن اسکا ساز بن جاتا ہے، اور ہر سو اسی کا جلوہ نظر آنے لگا

کس نے بھر دی یہ صدائے دلنواز　　ہر رگِ جاں سازِ الا اللہ ہے

کوئی ہو آواز میرے کان میں　　ہر صدا آوازِ الا اللہ ہے

کارفرما ایک آتا ہے نظر　　منکشف اب رازِ الا اللہ ہے

دل سے ہوتا ہے ترانہ خود بلند　　قلبِ ذاکر سازِ الا اللہ ہے

وجد میں جاں ہے تو اعضا رقص میں

جام مے آوازِ الا اللہ ہے

اس دور کا کلام اس قبیل کے وجدانی کوائف اور عارفانہ معارف حقائق سے معمور ہے، اتنی مثالیں اس کا اندازہ کرنے کے لیے کافی ہیں۔

سید صاحب نے مختلف اصنافِ سخن پر طبع آزمائی کی ہے، غزل کے علاوہ نعتیں، قومی نظمیں، مراثی، اور قطعات و رباعیات بھی کہے ہیں، جس سے ان کی قدرتِ کلام کا اندازہ ہوتا ہے، ان نظموں کی تعداد خاصی ہے، ان سب کی تفصیل طویل بھی ہے اور غیر ضروری بھی، اس لیے صرف ان کے نمونے نقل کیے جاتے ہیں۔

حج کے موقع پر انھوں نے کئی نعتیں کہی تھیں، اگرچہ وہ محض شاعر نہیں بلکہ مقامِ نبوت کے مرتبہ شناس اور اوصاف و خصائصِ نبوت کے عارف بھی تھے، اس لیے ان کی نعتوں میں شاعری سے زیادہ حقیقت کا بیان ہے، مدینہ طیبہ کی حاضری کے وقت بارگاہ رسالت میں یہ نعت پیش کی تھی۔

آدم کے لیے فخر یہ عالی نسبی ہو　　مکی مدنی ہاشمی و مطلبی ہے

پاکیزہ تر از عرش و سما جنت فردوس　　آرام گہِ پاک رسولِ عربی ہے

آہستہ قدم نیچی نگہ پست صدا ہو　　خوابیدہ یہاں روحِ رسولِ عربی ہے

اے زائرِ بیتِ نبوی یاد رہے یہ　　بے قاعدہ یاں جنبشِ لب بے ادبی ہے

کیا شان ہے اللہ رے محبوب نبی کی　　محبوب خدا ہے وہ جو محبوب نبی ہے

بجھ جائے تیرے چھینٹوں سے اے ابر کرم آج

جو آگ میرے سینہ میں مدت سے دبی ہے

سفرِ حج سے واپسی کے وقت حسب ذیل نعت کہی تھی

عشقِ نبوی دردِ معاصی کی دوا ہو　　ظلمتکدۂ دہر میں وہ شمع ہدیٰ ہے

پڑھتا ہو درود آپ ہی تجھ پر ترا خالق　　تصویر یہ خود اپنی مصور بھی فدا ہے

نورِ نبوی مقتبس از نورِ خدا ہے　　بندہ کو شرف نسبت مولیٰ سے ملا ہے

احمد سے پتہ ذاتِ احد کا جو ملا ہے ۔۔۔ مصنوع سے صانع کا پتہ سب کو چلا ہے

بندہ کی محبت سے ہے آقا کی محبت ۔۔۔ جو پیرو احمد ہو وہ محبوبِ خدا ہے

اے تری اے ابرِ کرم رونقِ عالم ۔۔۔ تیرے ہی لیے گلشنِ ہستی یہ بنا ہے

فردوس و جہنم تری تخلیق سے قائم ۔۔۔ یہ فرق بد و نیک ترے دم سے ہوا ہے

فرمانِ دو عالم تری توقیع سے نافذ ۔۔۔ تیری ہی شفاعت پہ رحیمی کی بنا ہے

لیجائے گا رہرو کو وہ منزل سے بہت دور

جو جادہ سفر کا ترے جادہ کے سوا ہے

ایک نظم "سر الحیات" میں قوم کی زبان سے مسلمانوں کی غفلت اور ان کے زوال کے اسباب کا ذکر کر کے ان کی تجدید کی اصل روح بیان کی،

(۱)

اک شور ہے کہ قوم میں اب زندگی نہیں ۔۔۔ شیرازۂ جماعتِ قومی ہے منتشر

فقدانِ آرزو ہے تمنا کا قحط ہے ۔۔۔ ترغیب کا نہ ذوق نہ ترہیب کا اثر

قوت نہ بازوؤں میں نہ سر میں بلند فکر ۔۔۔ کچھ اضطرابِ قلب نہ کچھ کاوشِ جگر

جوشِ عمل نہ ولولۂ کاروبار ہے ۔۔۔ اک موت سی ہے چھائی ہر اک فرد قوم پر

نے آرزوئے علم، نہ فکرِ حصولِ جاہ ۔۔۔ فارغ ہیں احتیاجِ زمانہ سے سر بسر

(۲)

اے چارہ گر تغافلِ دیریں سے ہوشیار ۔۔۔ معلوم ہے نہ رمزِ حیاتِ امم مگر

مانا کہ دست و پیر میں اب ارتعاش ہے ۔۔۔ مانا کہ پاؤں میں نہ رہی طاقتِ سفر

مانا کہ آبلوں سے ہیں تلوے بھرے ہوئے ۔۔۔ چرکے لگے ہوئے ہیں بہت جسمِ زار پر

مانا زباں میں طاقتِ گفتار بھی نہیں ۔۔۔ مانا نہیں ہے آنکھوں میں اب قوتِ نظر

یہ سب صحیح پر ہے ضروری بقائے روح ۔۔۔ لازم ہے فکرِ زخمِ جگر سب سے پیشتر

تعلیمِ نو، سیاستِ ملکی، فنونِ حال ۔۔۔ اکسیر ہیں مگر نہ دوائے دل و جگر

وہ جذبِ مذہبی ہے وہ ملت کا جوش ہے ۔۔۔ جو چشمۂ حیات ہے اور قوتِ بشر

پیدا ہو جب وہ آگ کے شعلوں کی شکل میں ۔۔۔ ہو جائے جب وہ برق کی صورت میں جلوہ گر

ان سست بازوؤں میں پہاڑوں کا زور ہو

ان مضمحل قویٰ میں ہو طوفان کا اثر

درسِ مساوات

نازشِ دودۂ عباسیہ ہارون رشید ۔۔۔ اک دفعہ شہر مدینہ کا کیا اس نے سفر

ساتھ شاہزادۂ مامون و امین دونوں تھے ۔۔۔ ایک تھا لختِ جگر دوسرا تھا نورِ بصر

اس زمانہ میں مدینہ کا تھا گوشہ گوشہ ۔۔۔ چشمۂ نورِ ہدیٰ منبعِ قرآن و اثر

ہر طرف زمزمۂ حدثنا اخبرنا ۔۔۔ ہر طرف شورِ نگن صلے علیٰ خیر بشر

ایک نقطہ پہ یہاں جمع تھا سارا عالم ۔۔۔ سند و چیں، شام و عرب، مغرب و مصر و بربر

آرزو تھی یہ خلیفہ کو مدینہ جا کر ۔۔۔ جائیں محروم نہ اس در سے مرے لختِ جگر

حکم پہنچا یہ خلافت سے کہ اے ابن انس ۔۔۔ مجمعِ عام میں جا سکتے نہیں میرے پسر

اس لیے آج یہ بہتر ہے کہ تعلیمِ حدیث ۔۔۔ آپ دیں خاص انھیں ایوانِ شہی میں آکر

سن کے فرمانِ خلافت کو یہ ارشاد ہوا ۔۔۔ اے خلیفہ تری تعمیل ضروری ہے مگر

ہے یہ علمِ نبوی تیرے ہی گھر کی دولت ۔۔۔ خواہ حرمت اسے دے خواہ اہانت اسے کر

سن کے ہارون نے دربارِ امامت کا جواب ۔۔۔ بھیجا پیغام کہ خیر آپ نہ آئیں گے اگر

خود یہ شہزادے وہاں درس میں حاضر ہونگے ۔۔۔ مگر اوروں کا نہ ہو بزم میں اس وقت گذر

مالک ابن انس نے اسے کہلا بھیجا ۔۔۔ میرے کاشانہ میں ممکن نہیں تمیزِ بشر

درگہ خاص نہیں درس گہ عام ہے یہ   ہو مساواتِ بشر معنی اسلام ہے یہ

ان نظموں میں مولانا شبلی کا رنگ نمایاں ہے۔

دریائے نربدا

اقبال کو گنگا کے کنارے اپنے کاروانِ رفتہ کی یاد آئی تھی،

اے آبِ رودِ گنگا وہ دن ہیں یاد تجھکو   اترا ترے کنارے جب کارواں ہمارا

سید صاحب کو دریائے نربدا دیکھکر اس کارواں کی یاد آئی اور اُن کے جذبات میں تلاطم پیدا ہوا

نربدا، اے نربدا، اے جادۂ بحرِ عرب   گرچہ تو ہندی ہے لیکن زادۂ بحرِ عرب

ہاں گذشتہ کارواں کا تو نشانِ راہ ہے   ہند میں اسلام کی تاریخ سے تو آگاہ ہے

جانتا ہے تو ہی تاریخ کا پوشیدہ راز   تیرے دروازے پہ ٹھہرا تھا مرا پہلا جہاز

ہند میں اسلام کے انجام کا آغاز تو   چار صدیوں تک رہا اسلام کا دمساز تو

رشتۂ ہند و عرب تجھسے ہوا تھا استوار   تیرے ساحل کا ہر اک ذرہ ہو اسکی یادگار

آج کس کو یاد ہے وہ داستانِ باستاں   تیرے ساحل پر جب اترا تھا عرب کا کارواں

تو ہو دریائی پری یا شاہدِ عالم ہے تو   اس سمندر کے گلے کی شہ رگِ اعظم ہے تو

اے بھروچ اے خاتمِ انگشت زرِ نربدا   عہد ماضی کی تری عزت رہے قائم سدا

تو تھا اے چشمِ زائر آج تیری خاک ہے   تیرا ساحل یادگارِ امتِ لولاک ہے

جب نگاہیں تیری جانب میں نے مشتاقانہ کیں
تیری موجیں کہنہ افسانوں کی سطریں بن گئیں

ایک حکیمانہ نظم "تسلسل حوادث" تاثیر اور سبق آموزی کے ساتھ سلاستِ بیان

کا بھی نمونہ ہے،

دمِ سرد ہے آہ پر آہ ہے   تسلسل حوادث کا جانکاہ ہے

بھروسہ نہیں اب بجھا تب بجھا   دم اپنا چراغِ سرِ راہ ہے

اٹھا بسترِ خواب آگے کو چل   ہوئی ختم شب اب سحرگاہ ہے

یہاں پیش بینی کوئی کیا کرے   یہاں جو مصیبت ہے ناگاہ ہے

اسے کب غموں سے رہائی ملے   جو وابستۂ ماسوی اللہ ہے

گدا سب کے در کے ہوس سے بنے   جو سب سے غنی ہے وہی شاہ ہے

ہر اک کی خوشامد ہر اک کی ثنا   اسیرِ بلا طالبِ جاہ ہے

سفر کی صعوبت سے دل کیوں ڈرے   اگر خضرِ توفیق ہمراہ ہے

اندھیرا ہے عالم میں چھایا ہوا   چراغِ جہاں قلبِ آگاہ ہے

مولانا شبلی مرحوم اور اپنی پہلی بیوی کی وفات پر بڑے دردانگیز مرثیے کہے، استاد کا مرثیہ بہت طویل ہے، بیوی کے مرثیے کے چند اشعار یہ ہیں۔

ہم سفر وادی ہستی میں وہ دلبر نہوا   شمع اس راہ میں اس کا رخِ روشن نہوا

درد اٹھ اٹھ کے مرے دل میں ٹھہر جاتا ہے   کیوں رگِ دل کی جگہ سینہ میں نشتر نہوا

یہ تماشائے جہاں خواب پریشاں ہی سہی   پر یہ کیوں خواب مرے واسطے شب بھر نہوا

کس سے کہیے دلِ شیدا کہ گلہ تنہائی   مسند آرا مرے پہلو میں جو دلبر نہوا

تیرے جانے پہ گماں تھا کہ نہو حشر بپا   تو گیا اور بپا دھر میں محشر نہوا

حیف اس خون کی قیمت جو مژہ سے ٹپکے   قطرۂ اشک ہوا گوہرِ احمر نہوا

فارسی شاعری پر ان کی نظر بہت وسیع تھی، اور اس کا ذوق بھی تھا، مگر خود فارسی میں

شق سخن کی طرف توجہ نہیں کی، اس لیے ان کی صرف دو نظمیں فارسی میں ملتی ہیں، ایک ندوہ میں مولانا شبلی کی مستقل آمد کے موقع پر ان کے استقبال کا قصیدہ، دوسری نظم یا غزل بہت بعد میں کہی تھی۔ قصیدہ کے اشعار یہ ہیں :-

بدہ ساقی مئے کو بفگند جلباب ظلمانی
خرد را نور بخشد از چراغ طور ایمانی

مئے کز جرعہ اش رونق فزاید لفظ و معنی را
دہد تیغ زباں را جوہر تیغ صفاہانی

مپرس افسانۂ دارا و اسکندر کہ می بافند
مپرس از دفتر پارین حکمت ہائے یونانی

ندارم گوش بر این نغمہ سنجہائے داؤدی
کہ گوشم ہست بر آواز مرغ باغ یزدانی

فدائے آں حدیث روح پرور باد ہر جانے
کہ جان نو دمد در مردہ دل چوں آب حیوانی

خدیو کشور معنی کہ فرمانش برد دلہا
چہ دلہا؟ سکہ بر جاں زد چہ بر قاصی چہ بر دانی

بپائے قصہ خوان جاہ افریدون و کیخسرو
بہ بیں اینجا کہ درویشے کند در فقر سلطانی

نہ ایوانے نہ دربانے نہ دیہیمے نہ اورنگے
نمی دارد بدستش ہیچ اسباب جہانبانی

ولے فرش سجدہ گاہ قصر ایوان شہنشاہی
بساطش بوسہ گاہ دانش آموزان یونانی

کہن دستار او بالاتر از اکلیل سلطانی
حصیر کلبہ اش بہتر ز اورنگ سلیمانی

عصائے موسوی کلکش ید بیضا ست قرطاسش
سطور صفحہ اش چوں خد بر رخسار نورانی

صریر خامہ اش نغمہ سرائے گلشن حکمت
مدادش از پئے چشم ورق کحل صفاہانی

سخن گوید لبش یا گوہر شہوار می بارد
چنیں گوہر نہ زنہار آفریدست ابر نیسانی

سنان خامہ اش کشور کشائے معنی و دانش
زبانگ طبل صیتش پر فضائے کون امکانی

ضمیرش چوں کند غواصی جیحون مشکلہا
برآرد دست فکرش صد درنا سفتۂ نورانی

بیانش ابر باران است چو می بخشد چو می بارد
ہجوم شور سرسبزی و سبزہ را فراوانی

مسیحا دم باعجاز قلم جان دگر بخشد
بحکم قم باذن العلم آں تن را کہ شد فانی

بخواہم از خداوندے کہ نامش حی و قیوم است
بماند زندۂ جاوید ایں شبلیِ نعمانی

یہ قصیدہ طالب علمی کے زمانہ کا ہے، اس سے اندازہ کیا جا سکتا ہے کہ اگر انھوں نے فارسی شاعری کی طرف توجہ کی ہوتی تو اس میں بھی انکا پایہ اردو شاعری سے کم نہ ہوتا، دوسری نظم یا غزل انھوں نے ۱۹۴۳ء میں مولانا اشرف علی صاحب سے ارادت کے بعد کہی تھی، اس میں ان کی باطنی کیفیت کا رنگ جھلکتا ہے۔

شیوۂ صید زبونم آرزوست
سینہ آغشتہ بخونم آرزوست

گوش می جوید پیام از وصل دوست
ارجعی و ارجعونم آرزوست

عشق را گوئی جنوں اے بیخبر
با ہمہ ہوش ایں جنونم آرزوست

داغ بر دل از غم انجام دل
مژدۂ لا تحزنونم آرزوست

قرب بے غیبت نماز عاشقاں
فی صلوۃٍ دائمونم آرزوست

می برد بیتابئ دل کو بہ کو
بر درت صبر و سکونم آرزوست

از حصار ایں و آں بیروں کشد
آں نگاہ پر فسونم آرزوست

بسکہ دزدیدہ نگہ بر من فگن
نشتر زخم دروںم آرزوست

خیر من ہست انچہ تو فرمودۂ
انچہ فرمودی ہمونم آرزوست

اس غزل کی شان نزول کے متعلق فرماتے ہیں کہ انتیسویں شب رمضان کو نماز تہجد پڑھکر ذکر کے لیے بیٹھا تھا کہ دفعۃً پوری غزل قلب پر وارد ہوئی، اس سے اس کی قیمت اور بڑھ جاتی ہے۔

فارسی کا ایک قطعہ بھی ملتا ہے، اس کی تقریب یہ ہے کہ سید صاحب ایک مرتبہ قیام حیدرآباد کے زمانہ میں حکیم الشعراء امجد حیدرآبادی سے ملنے کے لیے ان کے گھر تشریف لے گئے، امجد نے اس عزت افزائی پر یہ قطعہ کہا:

از جلوۂ حسنِ خویش حیران کردی ... کافر دل را اگر مسلماں کردی
بنواختی از قدومِ خود امجد را ... ایں مور ضعیف را سلیماں کردی

سید صاحب نے اس کے جواب میں یہ قطعہ ارشاد فرمایا:

امجد تو اسیر زلفِ احساں کردی ... وز زور سخن دلم درخشاں کردی
منت بہ غریب شہر حیداں کردی ... کاں مور ضعیف را سلیماں کردی

اگرچہ سید صاحب نے فارسی شاعری کی طرف بہت کم توجہ کی لیکن اس کے رموز و اسرار پر ان کی نظر بڑی گہری تھی، اسکا اندازہ علامہ اقبال کی مثنوی رموز بیخودی پر ان کے ریویو کے سلسلہ میں دونوں کی خط و کتابت سے ہوتا ہے، اس ریویو میں سید صاحب نے مثنوی کے محاسن اور معنوی خوبیوں کے اعتراف کے ساتھ اس کی لسانی فروگذاشتوں کی طرف اجمالی اشارہ کر دیا تھا، مگر اسکی وضاحت نہیں کی تھی، پھر علامہ اقبال کے استفسار پر انھوں نے انکے مسامحات لکھ بھیجے، اور اس سلسلہ میں دونوں میں خط و کتابت ہوئی جس میں اقبال نے سید صاحب کے بعض اعتراضات کو تسلیم کیا ہے اور بعض کے جوابات دیے ہیں، سید صاحب کے خطوط جن میں انھوں نے مسامحات کی تفصیل لکھی تھی، تو نظر سے نہیں گذرے لیکن ان کے جواب میں اقبال نے جو خطوط لکھے ہیں وہ اقبال نامے میں چھپ گئے ہیں، ان سے فارسی زبان میں سید صاحب کی دیدہ وری کا اندازہ ہوتا ہے، مگر طوالت کی وجہ سے ان کے نقل کرنے کی گنجائش نہیں ہے۔

حضرت سید عربی کے ممتاز ادیب تھے، ان کا عربی زبان و ادب کا ذوق بہت بلند تھا، ندوہ میں عربی ادب و انشاء کے استاد بھی رہ چکے تھے، طالب علمی کے زمانہ میں لکھنؤ کے عربی رسالہ البیان میں ان کے مضامین نکلتے تھے، انھوں نے عربی میں بھی شاعری کی ہے، اور چند نظمیں ایک نوٹ بک میں جمع کی تھیں، اس کو وہ غالباً اپنے ساتھ پاکستان لیتے گئے۔ افسوس ہے کہ وہ یہاں نہیں ہے، ورنہ ان کی عربی شاعری کا نمونہ بھی سامنے آجاتا،

مگر اس ذوقِ سخن اور تین زبانوں میں قدرت کلام کے باوجود، آخری دور کو چھوڑ کر وہ ایک عرصہ تک محض تفنن طبع کے طور پر شاعری کرتے تھے اور اس کو انھوں نے کوئی اہمیت نہیں دی، اس لیے کوئی تخلص اختیار نہیں کیا، اور جو غزلیں اور نظمیں شائع کیں وہ "رمزی" کے پردہ میں ہیں، ان کا اصلی میدان علم و فن اور تلاش و تحقیق تھا، اس میں ان کے کارنامے غیر فانی ہیں،

ثبت است بر جریدۂ عالم دوامِ ما

اس کی آب و تاب میں ان کی شاعری ماند پڑ گئی تھی،

تفسیر ماجدی اردو

تفسیر ماجدی اردو کا دوسرا اڈیشن بکثرت اضافوں کیساتھ خود صاحب تفسیر مولانا عبد الماجد دریابادی کے اہتمام و نگرانی میں ہندوستان میں چھپ رہا ہے، جسکی ابتک بحمد اللہ ۲ دو جلدیں مختلف پریسوں سے چھپ کر شائع ہو چکی ہیں، ایک سورہ فاتحہ سے آل عمران تک ہے اور دوسری سورۂ نساء سے سورہ توبہ تک۔ ہدیہ جلد اول طبع ثانی مجلد [illegible]، جلد دوم غیر مجلد [illegible]

پتہ: صدق بک ایجنسی، کچہری روڈ، لکھنؤ۔ دار المصنفین اعظم گڈھ

ابو الفضل اور اس کی انشاء پردازی پر ایک نظر

از سید صباح الدین عبد الرحمٰن

اکبر کو اکبر اعظم بنانے والا شیخ ابو الفضل ۹۵۸ھ (۱۵۵۱ء) میں پیدا ہوا، بچپن ہی سے اپنی ذہانت کے لیے بے نظیر تھا، اس نے آئین اکبری کے آخر میں اپنے اور اپنے خاندان کے جو حالات لکھے ہیں، اس میں وہ بیان کرتا ہے کہ جب وہ ایک سال کا تھا تو اس کو قوتِ گویائی حاصل ہو گئی، اور جب وہ پانچ سال کا تھا تو اس کو غیر متعارف اشیاء سے آگاہی ہو گئی، اور جب وہ سات برس کا ہوا تو اپنے والد بزرگوار کے علم کا خزانہ دار اور جواہر معانی کا نگہبان اور امین ہو گیا، اور جب وہ مدرسہ میں داخل ہوا تو جو کتاب اس کی نظر سے کبھی نہیں گذری تھی، وہ اس کی پڑھی ہوئی کتاب سے زیادہ سمجھ میں آنے لگی، وہ اپنی اس ذہانت کو نعمت الٰہی قرار دیتا ہے، جو بقول اس کے عرش تقدس سے اسکے قلب میں نزول صعودی کر گئی تھی، وہ کھانے پینے سے بے نیاز ہو کر صرف مطالعۂ کتب میں لگا رہتا، اس کے درس میں جو کتاب بھی ہوتی، اس کو زبانی یاد ہو جاتی، خواجہ ابو القاسم کا حاشیہ زبانی سنا سکتا تھا، وہ لکھتا ہے کہ اسی طالب علمی کے زمانہ میں صفاہانی کے حاشیے کا نصف سے زیادہ حصہ دیمک نے کھا لیا تھا، اس نے اس دیمک خوردہ حصہ کو

علیحدہ کر کے دوسرا کاغذ اس میں جوڑ دیا، اور پھر ذہن پر زور دیکر اندازہ سے دیمک خوردہ حصہ کو بھرنے لگا، اور جب سارے حصے بھر چکا تو اصل کتاب سے عبارت ملائی گئی، مقابلہ کرنے پر معلوم ہوا کہ دو مقامات پر ترادف یعنی ہم معنی الفاظ بدلے ہوئے تھے، اور تین چار جگہوں پر متقارب یعنی ملتے ہوئے الفاظ میں تھوڑا بہت فرق تھا، اس کی اس ذہانت پر تمام لوگ دنگ تھے، (آئین اکبری جلد سوم ص ۱۷ - ۲۱۵)

اکبر نامہ (جلد سوم ص ۸۴ - ۸۳) میں وہ لکھتا ہے کہ کمسنی ہی میں اپنی خود بینی اور خویش آرائی میں ظاہر بینی اور تقلید پرستی کے خلاف اس کو جنون پیدا ہو گیا تھا، والد بزرگوار کی خواہش کے خلاف اس کا جی چاہتا تھا کہ اپنے مزاج کی شوریدگی کو دبانے کی خاطر خطا کے داناؤں کے پاس چلا جاتا، یا کوہ لبنان کے مرتاضوں کی صحبت میں جا کر رہتا، یا تبت کے جوگیوں سے جا کر گفتگو کرتا، یا پرتگال کے پادریوں کا دامن جا کر تھام لیتا، یا فارس کے موبدوں کی صحبت میں بیٹھا رہتا، یا ہندوستان کے رموز دانوں کے یہاں جا کر پناہ لیتا، اسی شوریدگی میں ارباب صحو اور اصحاب سکر کی صحبتوں سے دل برداشتہ رہتا، ان ہی دنوں جب کہ وہ ذہنی پریشانیوں میں مبتلا تھا، تو آیۃ الکرسی کی ایک تفسیر لکھی اور اکبر کے حضور میں پیش کی، اکبر نے اس کو حسن قبول عطا کیا، اور اپنی نوازشوں سے نواز کے اپنی ملازمت میں داخل کیا، جس کے بعد وہ لکھتا ہے کہ اس رابطۂ روحانی کے بعد اس کی سراسیمگی اور حیرت جاتی رہی، اور وہ اکبر کو دانائے نہاں خانۂ اسرار الٰہی سمجھتا رہا (اکبر نامہ ج ۳ ص ۵۸)

ملا عبد القادر بدایونی ابو الفضل کے مذہبی عقیدوں سے خوش نہ تھے، وہ اکبر کے دین الٰہی کا علمبردار بھی بن گیا تھا، اس لیے ملا صاحب نے اس کے خلاف اپنی آزردگی اور کبیدگی کا اظہار نہایت سخت الفاظ میں کیا ہے، وہ لکھتے ہیں کہ "شیخ ابو الفضل نے دوسری بار دیالی کے

موقع پر آیۃ الکرسی کی تفسیر پیش کی جس میں بہت سے قرآنی دقائق و نکات تھے، مگر کہا جاتا ہے کہ یہ تصنیف اس کے والد کی ہے، بادشاہ نے اس کو پسند فرمایا، اور اس کی تاریخ "تفسیر اکبری" سے نکالی گئی، اس کے بعد ملا صاحب رقمطراز ہیں کہ بادشاہ نے فرعون صفت ملاؤں کی گوشمالی کے لیے ان سے (یعنی ملا صاحب سے) توقع لگا رکھی تھی، لیکن اب ان کو ایک موزوں آدمی مل گیا، ابوالفضل پہلے ہی سے علماء کا مخالف تھا، کیونکہ جیسا کہ ملا صاحب لکھتے ہیں شیخ عبد النبی، مخدوم الملک اور دوسرے تمام علماء نے ایک زمانہ میں شیخ مبارک ناگوری کی گرفتاری کے لیے محتسبوں کو مقرر کر رکھا تھا، ملا صاحب کا بیان ہے کہ شیخ ابوالفضل نے جلد ہی اپنی خدمت، زمانہ سازی، بد دیانتی، مزاج شناسی اور خوشامد سے بادشاہ کا زیادہ تقرب حاصل کیا، اور جیسے ہی اس کو موقع ملا، اس نے بادشاہ کی مدد سے ان تمام لوگوں کو رسوا کیا، جنھوں نے اس کے خاندان کو تکلیف پہنچائی تھی، ایک ایک سے انتقام لیا، اس کی وجہ سے بہت سے بزرگوں، لوگوں اور یتیموں کی مدد معاش اور وظیفے بند ہو گئے، اور جب اس کی وجہ سے فتنہ اٹھ کھڑا ہوا تو وہ یہ رباعی پڑھا کرتا تھا:

آتش بدو دست خویش در خرمن خویش ‍ ‍ ‍ ‍ چو خود زدہ ام چہ نالم از دشمن خویش
کس دشمنِ من نیست منم دشمنِ خویش ‍ ‍ ‍ ‍ اے وائے من و دست من و دامنِ خویش

بحث کے وقت اگر کوئی مجتہدین کا حوالہ دیتا تو وہ کہتا کہ فلاں حلوائی، فلاں موچی، اور فلاں چمار کی بات میرے لیے حجت نہیں، مشائخ اور علماء کا انکار اس کے لئے سازگار رہا، (منتخب التواریخ جلد دوم ص ۲۰۰ - ۱۹۹) - آگے چل کر ملا صاحب لکھتے ہیں کہ ان سے ایک بار فتحپور کے دیوان خانہ میں اس سے بحث ہو لی تو انھوں نے

اس سے پوچھا مشہور مذہبوں میں سے تمھارا میلان کس مذہب کی طرف ہے، تو اس نے جواب دیا کہ ابھی تو وہ چند دن الحاد کی وادی میں سیر کرنے کا ارادہ رکھتا ہے، ملا صاحب نے پھر طنزاً جواب دیا کہ نیک ارادہ ہے بشرطیکہ تم اپنی بیوی کو طلاق دے دو، جیسا کہ کہا گیا ہے،

بر داشت غل شرع بہ تائید ایزدی ‍ ‍ ‍ ‍ از گردن زمانہ علی ذکرہ السلام

یہ سنکر ابوالفضل ہنس پڑا، ملا صاحب یہ بھی لکھتے ہیں کہ وہ اپنی بد اعتقادیوں کی بنا پر حکومت کے صدر، قاضی، حکیم الملک اور مخدوم الملک جیسے بوڑھوں سے بحثیں کیا کرتا تھا، اور ان کی بے عزتی کرنے میں کوئی کسر نہیں اٹھا رکھتا تھا، اور خود بادشاہ اس کی ان باتوں سے خوش ہوتا، ایک دفعہ علماء نے آصف خاں میر بخشی کے ذریعہ خفیہ طور سے اس کے پاس یہ پیام بھجوایا کہ تم ہم لوگوں کے پیچھے کیوں پڑے رہتے ہو، تو اس نے جواب دیا کہ مجھکو اس حکایت کے مطابق سمجھو کہ میں ایک آدمی کا نوکر ہوں، بیگن کا نوکر نہیں ہوں، اس نے تھوڑی ہی مدت میں اپنی ذہانت، باپ کی معاونت، بادشاہ کی اعانت اور اپنی قسمت کی مساعدت سے ایک ایک کو ذلیل کیا، کوئی مسلمان بھی سوائے حکیم ابوالفتح اور ملا یزدی جو بعض مسائل میں اس سے متفق نہیں تھے، اس کے سامنے فروغ نہ پا سکا (ج ۲ ص ۹۳-۲۹۲)

یہ تو ابوالفضل کی سیرت کے متعلق ملا صاحب کا تجزیہ ہے، مگر ماثر الامراء کے مصنف نے ابوالفضل کے حالات میں اس کی سیرت کی برائیوں اور اچھائیوں دونوں پر تبصرہ کیا ہے، اس کی برائیاں جس طرح بیان کی گئی ہیں، ان کے علیحدہ علیحدہ ٹکڑوں کو ملا کر ہم یہاں پر درج کرتے ہیں:

ماثر الامراء کا مصنف لکھتا ہے: مشہور ہے کہ ایک روز سلطان سلیم (یعنی جہانگیر)

شیخ کے گھر پر آیا، دیکھا کہ چالیس کاتب بیٹھے قرآن اور تفسیر لکھ رہے ہیں، ان سب کو کتب کے اجزا کے ساتھ بادشاہ کے پاس لے گیا، اور بادشاہ کو شیخ ابوالفضل سے یہ کہکر بدظن کیا کہ ہم کو تو یہ اور چیزوں کی ترغیب دیتے ہیں، لیکن جب خلوت میں ہوتے ہیں تو کچھ اور ہی کام کرتے ہیں، اس روز سے قرب اور مصاحبت میں فتور واقع ہوگیا (مآثر الامراء ج ۲ ص ۶۱۱)

یہی مصنف یہ بھی تحریر کرتا ہے کہ جنت مکانی یعنی جہانگیر بادشاہ خود لکھتا ہے کہ شیخ ابوالفضل نے میرے والد کو یہ ذہن نشین کرادیا تھا کہ جناب ختمی پناہی صلی اللہ علیہ وسلم میں بڑی فصاحت تھی، قرآن ان ہی کا کلام ہے، اس لیے جب وہ دکن سے آرہا تھا تو میں نے ہر سنگھ دیو سے کہا کہ اس کو قتل کردے، اس کے بعد میرے والد اس اعتقاد سے باز آگئے (ص ۶۱۷)

تزک جہانگیری کے نولکشور اڈیشن میں تو جہانگیر کا یہ بیان نہیں ہے لیکن تزک جہانگیری کے اس انگریزی ترجمہ سے اسکی تصدیق ہوتی ہے جو میجر ڈیوڈ پرائس نے کیا تھا (ص ۵۲۔۵۳)

مآثر الامراء کے مصنف کا یہ بھی بیان ہے کہ شیخ ابوالفضل کی تکفیر خاص و عام دونوں کی زبان پر ہے، کچھ لوگ اس کو برہمنی طریقہ کا طعنہ دیتے ہیں، اور بعض لوگ اس کو آفتاب پرست کہتے ہیں، ایک گروہ اس کو دہریہ قرار دیتا ہے، اور جو لوگ تفریط سے کام لیتے ہیں، اس پر الحاد اور زندقہ کا الزام رکھتے ہیں، اور جو لوگ انصاف کو راہ دیتے ہیں، اسکو متصوفوں کے مقلدوں کی طرح صلح کل، وسیع المشرب، ہمہ اوست کا دعویدار، شریعت سے آزاد اور طریقہ اباحت کا پابند قرار دیتے ہیں، عالم آرائے عباسی کے مصنف کا بیان ہے کہ شیخ ابوالفضل نقطوی تھا...... علم نقطہ سے مراد الحاد، زندقہ، اباحت اور توسیع مشرب ہے، فلسفیوں کی طرح اس کے ماننے والے دنیا کی قدامت کے قائل ہیں حشر اور قیامت

سے انکار کرتے ہیں، اعمال کے حسن اور دنیا میں عافیت کو جنت، اور اعمال کے قبح اور دنیا میں تکلیفوں کو دوزخ قرار دیتے ہیں۔

مآثر الامرا کے مؤلف نے خود ہی یہ سوال کیا ہے کہ شیخ ابوالفضل میں بڑی ذہانت، دقت نظر اور تحقیق تھی، تو پھر اس نے آخرت کے معاملہ میں دیدہ و دانستہ کیوں نقصان برداشت کر لیا، اس کا جواب بھی وہ خود یہ دیتا ہے کہ اکبر سن شعور کے آغاز ہی سے ہندوستان کے رسوم و رواج کی طرف مائل تھا، وہ راجپوتوں کے تالیف قلب کو ملک کا سب سے اہم معاملہ سمجھتا تھا، اور اسی کے لیے کوشاں رہا، یہانتک کہ ذبیحہ گاؤ کی ممانعت کر دی، داڑھی منڈوانے لگا، کانوں میں مروارید کے بندے پہننے لگا، دسہرہ اور دیوالی کا جشن بھی منانا شروع کر دیا، شیخ ابوالفضل کو بادشاہ کے مزاج میں بڑا دخل تھا، وہ اس کو ان باتوں سے روک سکتا تھا، لیکن اپنے حب جاہ کی خاطر ایسا نہ کر سکا، اور ان باتوں کا الزام اس پر بھی آتا ہے (ص ۶۱۹-۲۰)

مآثر الامرا کے مولف نے ابوالفضل پر اس قسم کی تنقیدیں کرکے یہ بھی لکھا ہے کہ ذخیرۃ الخوانین میں ہے کہ وہ راتوں کو درویشوں کے گھروں پر جاتا، ان کو اشرفیاں دیتا، اور ان سے التماس کرتا کہ وہ اس کے ایمان کی سلامتی کے لیے دعائیں کریں، اس کی باتوں کا زور اس پر ہوتا کہ آہ اب کیا کرنا چاہیے، وہ رانوں پر ہاتھ مارتا اور آہ سرد کھینچتا، اس کی زبان پر کبھی نا روا بات نہیں آتی، اس کی سرکار میں بدگوئی، غیر حاضری کا جرمانہ، بازیافت اور فروغی یعنی قرقی وغیرہ نہیں ہوتی، جس کسی کو وہ مال مقرر کر دیتا، اگر وہ برا بھی ثابت ہوتا تو حتی المقدور اس کو نہ بدلتا، کہا کرتا کہ لوگ مجھکو بیوقوف سمجھیں گے کہ یہ برا تھا تو اسکی تربیت کیوں کی۔ (ج ۲ ص ۶۲۰)

ماثر الامراء کے مصنف کا یہ بھی بیان ہے کہ جب شیخ ابوالفضل کا انتقال ہوا تو خان اعظم نے اسکی تاریخ وفات یہ کہہ کر نکالی

تیغ اعجاز نبی اللہ سر باغی برید

لیکن کہتے ہیں کہ شیخ نے خواب میں آکر کہا کہ میری تاریخ وفات بندہ ابوالفضل (۱۰۱۱) ہے، کارخانۂ قدرت میں حیران نہیں ہونا چاہیے، اس کا فضل بہت وسیع ہے، کسی کو ناامید ہونے کی ضرورت نہیں،

ماثر الامراء کے مصنف نے یہ بھی لکھا ہے کہ شاہ ابوالمعالی قادری سے جو کہ لاہور کے مشائخ میں سے تھے، روایت ہے کہ انھوں نے کہا کہ میں ابوالفضل کے کاموں کا منکر تھا، مگر میں نے ایک رات خواب میں دیکھا کہ جناب رسالت کی مجلس میں ابوالفضل کو حاضر کیا گیا، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنا جبۂ مبارک شیخ کے منہ پر ڈال دیا اور مجلس میں بٹھایا، اور فرمایا کہ یہ شخص اپنی زندگی میں کچھ روز برے افعال کا مرتکب ہوا لیکن اسکی وہ مناجات اس کی نجات کا سبب بن گئی جس کی ابتدا میں یہ کہا گیا ہے:

الٰہی نیکاں را بوسیلۂ نیکی سرفرازی بخشی
وبداں را بمقتضائے کرم دلنوازی کنی

ابوالفضل نے آئین کے آخر میں اپنے خاندان کے حالات کے علاوہ اپنے کچھ جذبات و خیالات کا بھی اظہار کیا ہے، جس سے پتہ چلتا ہے کہ وہ ملحد تو ہرگز نہ تھا بلکہ ہمیشہ اللہ تعالیٰ کی رحمتوں اور برکتوں کا طلب گار رہا، وہ لکھتا ہے کہ آغاز پیدائش سے پروردگار عالم نے اس کو اپنی متواتر نعمتوں سے اپنی پناہ اور حمایت میں لیا، اور اس کو امید ہے کہ اس کا آخری نفس اسی کی رضامندی میں صرف ہوگا، اور

اسی کی بدولت اس کو آرام گاہ جاوید میں جگہ ملے گی، اس کے بعد وہ خداوند تعالیٰ کی ان چوبیس (۲۴) نعمتوں کا ذکر کرتا ہے جن سے وہ سرفراز ہوتا رہا ہے، ان میں سے کچھ یہ ہیں:

(۱) اس کو والدین کی رضاجوئی کا روز افزوں شوق رہا (۲) وہ بارگاہ ایزدی کا ہمیشہ نیازمند رہا (۳) وہ ہر مذہب و ملت کے علوم کے راز کو جاننے کی کوشش کرتا رہا، (۴) وہ خدا کے اُن بندوں کے دروازے پر حاضر ہوتا رہا جو گوشہ نشین تھے، اور اپنی پختہ عقل کے معیار میں درست ثابت ہو چکے تھے (۵) وہ اپنی طبیعت کی نیرنگیوں کی وجہ سے نئی نئی باتیں دریافت کر کے متحیر ہوتا رہا (۶) وہ جہاں پناہ یعنی اکبر کی ملازمت کی برکت سے غرور سے پاک رہا (۷) وہ صلح کل تھا، اس لیے ہر گروہ کے نیک افراد سے صلح کرتا رہا، برے لوگوں کی معذرت کو بھی قبول کر کے ان کے ساتھ مصالحت کی بنیاد ڈال دی،

اسی سلسلے میں یہ دعا کرتا ہے:

"اللہ تعالیٰ از لوامع آگہی نقش بدی دور سازد"

اس کا مذہبی عقیدہ جو بھی رہا ہو لیکن وہ ایک بے مثل ادیب کی حیثیت سے ہمیشہ یاد کیا جاتا رہا ہے، مآثر الامراء کے مصنف نے لکھا ہے کہ وہ اپنی جودت طبع، رسائی فہم علوئے فطرت اور طلاقت لسانی کی وجہ سے یگانہ و بے ہمتائے وقت تھا (حصہ دوم ص ۶۰۸) محمد حسین آزاد لکھتے ہیں کہ شیخ کی انشاپردازی اور مطلب نگاری کی تعریف نہیں ہوسکتی، یہ نعمت خداداد ہے کہ خدا کے ہاں سے اپنے ساتھ لایا تھا، ہر ایک مطلب کو اس خوبی سے ادا کرتا ہے کہ سمجھنے والا دیکھتا رہ جاتا ہے،...... یہ قادر الکلام اپنے پاک خیالات اور سادہ الفاظ میں اصلی مطلب کو اس طرح ادا کرتا ہے کہ ہزار رنگینیاں ان پر قربان ہوتی ہیں، اس کی سادگی کے باغ میں رنگ آمیزی کا مصور قلم لگائے تو ہاتھ قلم ہو جائیں، وہ

انشاء پردازی کا خدا ہے، اپنے لطف خیالات سے جیسی مخلوق چاہتا ہے الفاظ کے قالب میں ڈھال دیتا ہے، لطف یہ ہے کہ جس عالم میں لکھتا ہے، نیا ڈھنگ ہے اور جتنا لکھتا جاتا ہے، عبارت کا زور بڑھتا اور چڑھتا چلا جاتا ہے (دربار اکبری ص ۴۹۳) بلاخمن آئین اکبری کی تمہید میں کہتا ہے کہ "عبداللہ شاہ بخارا کہا کرتا تھا کہ وہ اکبر کے تیروں سے اتنا نہیں ڈرتا جتنا کہ ابوالفضل کے قلم سے ڈرتا ہے"۔

ابوالفضل نے اپنی علمی سرگرمیوں کے سلسلے میں مہابھارت کے فارسی ترجمہ رزم نامہ کے لیے دو جزء کا حصہ لکھا، انجیل کا فارسی ترجمہ بھی کیا، ملا حسین واعظ نے کلیلہ دمنہ کا جو ترجمہ فارسی میں کیا تھا، اس کو آسان اور سلیس کیا، اور اس کا نام عیار دانش رکھا، ان کے علاوہ انشائے ابوالفضل، کشکول اور جامع اللغات بھی اس کی علمی یادگاریں ہیں لیکن اسکی زیادہ شہرت اس کے اکبرنامہ اور آئین اکبری کی وجہ سے ہوئی، ان دونوں کتابوں کے لکھتے وقت وہ بڑا مبالغہ پرداز مصنف نظر آتا ہے لیکن اس کی مبالغہ پردازی، مداحی، خوشامد پرستی اور چاپلوسی پر چاہے کتنے ہی اعتراضات کیے جائیں، اس کی انشاپردازی کی سحر نگاری اپنی جگہ پر قائم رہتی ہے، مآثر الامراء کے مصنف کا بیان ہے کہ لوگوں کا خیال تھا کہ ابوالفضل نے اکبرنامہ میں خمسۂ نظامی کی نثر کر دی ہے۔

اب دیکھنا یہ ہے کہ اکبرنامہ اور آئین اکبری میں انشاء پردازی کی گلکاریاں اور جلوہ سامانیاں کن کن طریقوں سے دکھائی دیتی ہیں، اسکے مصنف نے اکبر کی ذات کو اپنے لیے شمع بنا رکھا تھا، اور اس کے گرد پروانہ کی طرح رقص کرتا ہوا نظر آتا ہے، اسکی مدح میں اسکا قلم چلتا ہو تو کسی طرح رُک کے نہیں رکتا ہے، فوج در فوج الفاظ کے سہارے اپنی انشاپردازی میں قوت بھی پیدا کرتا ہے، اور اپنے شاہی آقا کی تعریف کرکے ذہنی سکون اور روحانی لذت

محسوس کرتا ہے، اکبرنامہ جلد سوم کے آغاز میں اس کی قصیدہ خوانی اس طرح کرتا ہے:

دیدۂ باریک بینش اصطرلاب آفتاب ذات و دل حق گزینش، رصد خانۂ سعادات صفات، نژاد دیرنگ، روی خوش، خوی نیک، پیشانی کشادہ، قامت معتدل، فطرت عالی، ہمت والا، نیت صافی، توکل بر دوام، دانش بر کمال، گرد آمدن گوناگوں ہنر، حوصلۂ فراخ، آزرم سترگ، شجاعت شگرف، رائے درست، تدبیر گزین، بخشش بے محابا، بخشایش بیکراں، افزایش عاطفت، صلح کل، انبوہیٔ ملک، فراوانی ارباب اخلاص، بسیاری مبارزان یک جہت، فزونی مال، فراہم شدن نفائس عالم، صفائی ضمیر، پاکی از آلایش تعلق، پیشوای جہان معنی، آگہی دانائی، چگونہ در یک جا فراہم آید، وچسان یک تن بر دوش ہمت بر دارد؟

سپہر دانش و بینش یگانہ اکبر شاہ	کہ ہم چو صبح بروے جہاں کشادہ جبیں
شہے کہ دیدہ ز آموزگار دل تعلیم	شہے کہ یافتہ از مرشد خرد تلقین

اور نثر کی عبارت میں جو رنگینی اور شگفتگی ہے، وہ بڑے بڑے شعرا نظم میں بھی نہیں پیدا کر سکتے۔ اس نثر میں حسین اشعار کا لطف آتا ہے، پڑھتے وقت لکھنے والے کے نہ صرف زور بیان اور قدرت الفاظ کا سکہ جمتا ہے، بلکہ اس نثر میں کسی مثنوی کے اشعار کے پڑھنے کی لذت محسوس ہوتی ہے۔

ابوالفضل غایت احترام میں اپنی کتاب اکبرنامہ کو اکبرنامہ نہیں لکھتا ہے، کیونکہ اس کے خیال میں اکبر کا نام لکھنے میں بھی سوء احترام کا احتمال پیدا ہوتا تھا، اس لیے اپنی کتاب کو کبھی تو اقبال نامہ، کبھی نگارین نامہ اور کبھی شگرف نامہ کے نام سے یاد کرتا ہے، پھر پوری کتاب میں کہیں اکبر کا نام نہیں آیا ہے، اس کے لیے طرح طرح کے القاب استعمال

کرتا ہے، ان القاب کے ڈھونڈنے میں اس کا ذہن خوب کام کرتا ہے، جن میں سے کچھ یہ ہیں:

شہریار جہانگیر، آئین عظمت و جلالت، شہریار آگاہ دل، شہریار جہاں آرا، شہریار دانش پژوہ، شہریار معدلت دوست، شہریار دادگر، خدیو خدا پرست، حق سگال، گیہان خدیو دادگر، خدیو دانش پژوہ، گیتی خدیو، خدیو عالم، خدیو جہاں آرا، ہمت والائے شاہنشاہی، جہاں کشائے شاہنشاہی گیتی کشائی، جہانگیر کشورکشائی، زینت بخش اورنگ سلطنت، فرہنگ آرائے بزم آفرینش، گیتی آرائے حکمت پژوہ، فرہنگ افزائے ملکوتیاں قدس وغیرہ۔

اکبر جب کہیں اپنے لشکر کے ساتھ پڑاؤ ڈالتا تو ابوالفضل اسکو اس طرح ادا کرتا:

"مخیم سرادقات اقبال گشت"۔ "مخیم سرادقات عظمت شد"۔ "مخیم ہمایوں شد"

"مضرب خیام عز و جلال شد"۔ "گیہان خدیو داد دہاں و نوازش کناں با بزاراں

شکوہ صوری و معنوی بر کنار دریائے سند نزول اجلال فرمود"۔ "شعشعۂ رایات ہمایوں

در حوالی بانسوالہ پرتو شکوہ انداخت"۔

اور جب اکبر دارالسلطنت کی طرف واپس ہوتا تو اسکے ادا کرنے کیلیے یہ طریقہ استعمال کرتا ہے:

"ہم عنانی دولت روز افزوں متوجہ دارالخلافہ شدند"۔ "رایات نصرت شعاع

در مستقر سلطنت نہضت فرماید"۔

اور جب سفر میں لوگوں کی باریابی ہوتی تو اس کو اس طرح ادا کرتا:

"طبقات انام از اشراف تا محترفہ جوق در جوق اعتماد بر معدلت و رافت شاہنشاہی

نمودہ بہ دولت زمین بوس سعادت پذیرگشتہ"۔

یا جب دو چار افراد باریاب ہوتے تو اس کے بارے میں لکھتا ہے:

"بہ سجدۂ نیایش ناصیۂ بخت وری برافروختند"۔

اکبر فتح و تسخیر کے سلسلہ میں لشکر کشی کرتا تو اس کی انشا پردازانہ تاویل اس طرح کرتا:

"وچوں در دین سلطنت و آئین جہاں داری قناعت در ملک ستانی چو حرص تجرد گزینیاں نکوہیدۂ عقل و ناپسندیدۂ خرد پژوہان است۔ تسخیر قلعۂ تباس پیش نہاد

ہمت والا شد"۔ (جلد سوم ص ۱۰۴)

"دولت افزائی را سرمایۂ ایزدی نیایش انگاشتہ خداوندی را ہم آغوش

پرستاری دارد"۔ (جلد سوم ص ۵۱۱)

اکبر کا سب سے کمزور پہلو اسلام سے منحرف ہو کر دین الٰہی کا بانی ہو جانا تھا، لیکن اکبرنامہ میں کہیں "دین الٰہی" کا نام نہیں آنے پایا ہے۔ اس انحراف کی تاویل ابوالفضل کی انشاپردازی کے کمالات کی ایک بڑی دلیل ہے۔ وہ اکبرنامہ میں عبادت خانہ کے مباحث کی بڑی اچھی تصویر کھینچتا ہے، پھر جب اکبر اعلان کرتا ہے کہ کلمہ پڑھنا، ختنہ کرانا، سجدہ کرنا جیسے ظواہر مذہب کے لیے ضروری نہیں، مذہب وہی اچھا ہے جو عقل تسلیم کرے۔ اور عقل کو قائل کرنے کے لیے دلیل چاہیے۔ سچائی کسی کی پیشانی پر لکھی ہوئی نہیں رہتی ہے، تو اس کو ابوالفضل اپنے انشار پردازانہ انداز میں اس طرح پیش کرتا ہے۔ (جلد سوم ص ۲۵۵)

"ہموارہ دراں شبہائے روز آسا جلائل نکات و سخنان دل آویز بہ زبان گوہر آمود گذارش یافتے، از انجملہ بر لوحۂ بیان نگارش فرمودند کہ بشیر از ہم زبانی ظاہر آرایان خراب درون چناں بخاطر می رسید کہ صورت آرائی و حرف مسلمانی بے پذیرائی درونی فائدہ بخشد، بدیں جہت بسیارے گردیدگان کیش برہمن را بہ بیم افزائی و زور آوری رہ گرائے دین بزرگان خود گردانیدیم امروز کہ برتو حقیقت شہرستان باطن را فراگرفتہ) چناں فروغ آگہی می تابد کہ دریں آشوب گاہ اخلاف و کترگی بندار

و تاریکی خود بینی تو بر تو فراہم آمدہ) بے مشعل دلیل قدمے نتواں رفت و آں روشن
سود مند آید کہ بصواب دید خود برگیرند از نہیب سلطانی کلمۂ شہادت بر زبان راندن
و پوست پارہ جدا کردن و سر استخوانی بر زمین ماندن خدا پژوہی نبود"

طاعت آں نیست کہ بر خاک نہی پیشانی — صدق پیش آر کہ اخلاص بہ پیشانی نیست

وہ دین الٰہی کے حامیوں کے عقیدہ و مسلک کی کوئی تفصیل نہیں بتاتا ہے، بلکہ آئین اکبری میں دین الٰہی کے لیے رہنمونی کا لفظ استعمال کرتا ہے، اور اس کی وکالت اس طرح کرتا ہے کہ جب پروردگار عالم چاہتا ہے کہ انسان کا جوہر ظاہر ہو اور اہل علم نظر کی کشادگی کے ساتھ ہمت کی پستی سے بھی آشنا ہوں تو انسانی نگاہ دورنگی کے غبار سے آلودہ ہو جاتی ہے، اور ہر شخص ایک نیا دین اپنے لیے منتخب کر لیتا ہے، جس کے بعد بد اندیشی اور کوتاہ نظری نمایاں ہو جاتی ہے، اور قدر شناسی اور مہراندوزی ختم ہو جاتی ہے۔ ورنہ ظاہر ہے کہ دین کیا اور دنیا کیا، ایک ہی دل آویز حسن ہے، جس میں ہزار پردوں کے باوجود ایک خاص قسم کی تابش ہے، اب اس کو ابوالفضل اپنے قلم سے اس طرح ادا کرتا ہے۔

ایزد خرد بخش جہاں آرا چوں خواہد کہ گوہر مردم زاد بظہور آید و پایہ فراخی و تنگی حوصلہ برگماں پیدائی گیرد، غبار دورنگی برانگیزد و دین و دنیا برطرازد، ہر نشاد را کار کیائی جداگانہ پدید آید و در نکوہش یک دیگر آویزش رود، ناتواں بینی و بے دانشی عیار گرفتہ قدردانی و مہراندوزی گراں ارز گردد و گرنہ کدام دین و چہ دنیا، یک حسن دل آویز در ہزار پردہ جلوہ‌اش می دہد، گلیمے پہناور گستردہ اند وہ گوناگوں رنگ چہرہ می افروزد۔

در حقیقت نسب عاشق و معشوق یکے است — بوالفضولاں صنم و برہمنے ساختہ اند

یک چراغ است دریں خانہ و از پرتو آں — ہر کجا می نگرم انجمنے ساختہ اند

اور پھر وہ یہ بتاتا ہے کہ وجود کی ایک وسیع چادر پھیلی ہوئی ہے جس پر طرح طرح کے نقش و نگار بنے ہوئے ہیں، کوئی نفس کی توہین میں لگا ہوا ہے، اور کوئی اہل عالم کی نگہبانی میں مشغول ہے، لیکن جب انسان پر یک رنگی نمودار ہوتی ہے تو وہ پردۂ تقلید کے تار و پود کو بکھیر دیتا ہے، لیکن ہر گھر میں اس دانائی کی مشعل روشن نہیں ہو سکتی، درد آشنا قلب ہی میں یہ روشنی دکھائی دیتی ہے، اور جب بنی نوع انسان کی قسمت کی بلندی کا وقت آتا ہے، تو مشیت الٰہی فرمانروائے وقت اسرار یکرنگی سے آشنا کرتا ہے۔ اس کے قلب میں نور آگاہی کی شمع روشن ہوتی ہے، اور اس کے صحیفۂ دل سے دوئی کے نقوش مٹ جاتے ہیں، اور پھر وہ کثرت میں وحدت کا جلوہ دیکھتا ہے، اس کے بعد اکبر کو اس مذہب کے بانی کی حیثیت سے اس طرح پیش کرتا ہے

سواد خوانان ناصیۂ روزگار از سر آغاز ایں والا گوہر شناسائی شدند و بار از داران زمزمۂ شادمانی داشتند و شہریار دوربین روزگارے بآئین بیگانگاں پردہ آراستی و خود را آشنائے ایں کار نساختی لیکن برانچہ خدا خواہد کرا نبرد کہ ازاں برکنارہ شود، نخستیں حال انچہ عادتیان روزگار از دو بشگفت زار در شوند تا خواستہ برتراز دید کی چند آنکہ بے خواہش دل افزایش گرفت و بر فراز پیدائی بر آمد، اگرچہ بر رہنمونی را رضامندی ایزدی بر شمردہ در ہدایت نشود و تشنہ دلاں تقلید کہ دشت جویائی را سیراب گردانید (آئین اکبری جلد اول ص ۱۰۹)

وہ یہ کہنا چاہتا ہے کہ بادشاہ کے دل میں حقائق و معارف کا ظہور ہونے لگا، ان میں ہدایت و رہنمائی کی لہریں اٹھنے لگیں، اور انھوں نے مجبور ہو کر پیشوائی اختیار کی،

کیونکہ یہی مرضی الٰہی تھی، اور پھر وہ یہ لکھتا ہے کہ فقیر، سنیاسی، جوگی، قلندر، حکیم، صوفی سب ہی ان کے حلقۂ ارادت میں داخل ہونے لگے، لوگ ان سے سعادت دارین، صحت، تندرستی، بینائی چشم، تمنائے اولاد، درازی عمر، وسعت ترقی وغیرہ کی دعائیں کراتے تھے، اسی سلسلہ میں اکبر کے ایک دو معجزہ کا بھی ذکر کیا گیا ہے، لیکن اس کے ذکر کرنے کا انداز کچھ ایسا ہے کہ اس پیمبرانہ شان میں اکبر کی ذات مضحک نہیں بننے پاتی، بلکہ اس کا شاہانہ وقار قائم رہتا ہے، وہ اس مذہب کے عقائد کے بارے میں صرف اتنا لکھتا ہے کہ جب کوئی اس حلقۂ ارادت میں داخل ہوتا ہے تو وہ اپنے ارادت مند کو زنار یا انگشتری دیتے ہیں جس پر اسم اعظم و نقش اللہ اکبر کندہ ہوتا ہے، اس ارادت کے وقت ارادت مند کو اس نے اس طرح پیش کیا ہے کہ وہ زبان حال سے یہ کہتا ہے کہ میں نے اپنے طالع کی یاوری اور ستارۂ اقبال کے عروج سے خود غرضی اور ریاکاری سے جو تمام برائیوں کی جڑ ہے، کنارہ کشی کی،

بزبان حال چناں سراید کہ بیاوری بخت بیدار و رہ نمونی ستارۂ خود آرائی

و خویشتن گزینی کہ بیگاہ گزناگوں گزند بود از سر افگندہ روئے دل بنیایش گری آوردم (آئین اکبری ج ۳ ص ۱۰)

لفظ زبان حال سے ظاہر ہے کہ ان الفاظ کا دہرانا ضروری تھا،

ابوالفضل کا بیان ہے کہ ارادت مندوں کا دستور تھا کہ ایک اللہ اکبر کہتا تو دوسرا اس کے جواب میں جل جلالہ کہتا، اس کی تاویل میں ابوالفضل لکھتا ہے کہ اس کا صرف مقصد یہ تھا کہ بنی نوع انسان سرچشمۂ ہستی کو فراموش نہ کریں، اور ہر وقت ذکر الٰہی سے سیراب دل، تر زبان اور شیریں زبان رہیں،

ہنگام دیدار ہم آنکہ یکے اللہ اکبر گوید و دیگرے جل جلالہ سراید ہمگی قدس بسیج

آنست از سرچشمۂ ہستی فراموشی نیارند و بیاد ذکر الٰہی سیراب دل، و تر زبان و شیریں کام باشند (ایضاً ص ۱۱۰)

اس مذہب کے جو عقائد ابوالفضل نے بتائے ہیں، وہ صرف یہ ہیں:

(۱) مرنے کے بعد خیر و خیرات کرنے کے بجائے زندگی ہی میں کیجائے، تاکہ سفر آخرت کا پورا سامان ہو (۲) اس طرح سالگرہ کے موقع پر دعوت کیجائے، طرح طرح کے کھانے ہوں، تاکہ اس طرح جود و سخا کے ساتھ آئندہ سفر کا زادراہ بھی تیار ہوتا رہے (۳) گوشت خواری سے حتی الامکان پرہیز ہو (۴) اس مذہب کے پیرو قصاب، ماہی گیر، اور چڑیماروں وغیرہ کے ساتھ کھانا نہ کھائیں (۵) اور وہ حاملہ عورتوں، بوڑھوں، عقیموں اور نابالغ لڑکوں سے میل جول نہ رکھیں، ان کو وہ آئین ارادت گزینان کے تحت اس طرح ادا کرتا ہے:

و نیز نغز مالش آں پیشوائے آگاہ دلاں ہشیار خرام استی کہ مردم پس از فرو شدن بکار برند در زندگی سرانجام دہند و توشۂ واپسیں سفر پیش رواں شود، ہر سال روز ولادت انجمنے برسازند و خوان گوناگوں نعمت برکشند دست نوال برکشایند و زاد راہ دراز آمادہ گردد، نیز بآئین مقدس در ناخوردن گوشت ہمت گمارند و برخے در ہماں ہنگام کہ بگماں را بار دارند دست بدو نیالائید لیکن در ماہ ولادت خود نزد ویں نشوند، و نیز پیرامون کشتۂ خود نگردند و بکوزۂ آں نشابند و با قصاب و ماہی نکاہ، و کنجشک گیر ہم کاسے نکنند و با آبستن و کہن سال دنا زائی و نارس نہ پیوندند (جلد اول ص ۱۱۰)

ابوالفضل کی تحریر کے ایجاز کی یہ بڑی اچھی مثال ہے، معلوم نہیں اکبر اس ایجاز سے

مطمئن تھا کہ نہیں یا شاید اپنے علم کی بے بضاعتی کی وجہ سے اس عبارت کو پوری طرح
سمجھ نہ سکا ہو، اس ایجاز سے اندازہ ہوتا ہے کہ ابوالفضل بطیب خاطر اس مذہب کا قائل نہ تھا،
اس لیے اس کی تفصیل لکھنے میں اس کے قلم میں وہ روانی اور توانائی نہ پیدا ہو سکی، جو اس
کی امتیازی خصوصیت ہے، وہ رموز حقیقت زبانِ گو مگو میں بھی بیان کرنے میں ماہر تھا،

(جلد دوم ص ۳۸۰)

اس کا قلم اکبر کے رزم اور بزم دونوں کی نقش آرائی میں طاؤس کی طرح رقص
کرنے لگتا ہے، اکبر کے دورِ حکومت میں بکثرت لڑائیاں ہوتی رہیں، ابوالفضل ہر لڑائی
کی تصویر کشی میں جدا جدا رنگ اختیار کرتا ہے، وہ شاہی لشکر کے فوجیوں کے لیے
مردانِ کارداں، کند آوران ہمت گزیں، دلیران کارطلب، گروہ پر دلان، اخلاص
مندانِ کارطلب، سپاہ نیک فرجام، دلیران ناموس دوست، یلان گرم کیں، سپاہ چیرہ دست،
مجاہدانِ نصرت طراز، ہوا خواہان جاوید دولت، فیروزی سپاہ وغیرہ، اور شاہی لشکر کے
دشمنوں کیلئے غنیم خدا ستیز، بدگوہران نافرجام، ناسپاسان بدگوہر، بیم تا کان گریز پا، تباہ اندیشانِ ہرزہ درا،
سرتابانِ باطل ستیز، سرگردانِ بادیہ ادبار وغیرہ طرح طرح کے الفاظ اور فقرے استعمال کرنے میں اپنی قدرت زبان کا ثبوت دیتا ہے،

ایک جنگ کی تصویر اس طرح کھینچتا ہے　(ج ۲ ص ۲۲۳)

بعضے در مساکن و منازل خود بر سر جہل نہادہ ترصد ہلاک می بردند و جمعے شمشیرہائے
برہنہ علم کردہ و نیزہائے کوتاہ گرفتہ بہ غازیان نصرت پیوند می آوردند و این بہادران
غزا اندیشہ بناوک دلدوز و تیغ معرکہ سوز و سنان صف شگاف کار آں سیہ بختان
را تمام می ساختند و جمعے گرشکدہا و خانہا قدم جہل را پائے ثبات دادہ بودند غازیان
اقبال مند را دیدہ بہ پاسے تہور برون می دویدند و بہ بہادران نارسیدہ بہ صدمات قہر

بخاک و خون برابر می شدند

چنیں رزمہا در جہاں کس ندید　　　نہ از کار دانانِ گیتی شنید
چہ گویم از ان جنگ آں کارزار　　　کہ یک شمہ نتوانم از صد ہزار

ایک اور لڑائی کا ذکر کرتا ہے:

بہادران عساکر اقبال راہ کارزار کشادہ یافتہ پیش دویدند، و راجپوتان
ستیزہ خوی دست از جان شستہ گرم قتال گشتند، مصادمۂ عظیم و مقاتلۂ قوی
افتاد و تمام آں روز بازار جنگ گرم بود و از دو جانب دلاوران داد شجاعت
می دادند، مجاہدانِ غازی جرعۂ شہادت کشیدہ حیات ابد یافتند و جمعے کثیر از
ارباب خلاف خونابہ حما چشیدہ مست جام فنا گشتند　(ج ۲ ص ۱۶۱)

جب لڑائی کا ہنگامہ شروع ہوتا اور لشکری کٹ مرتے تو اس کو وہ ان
الفاظ میں بیان کرتا ہے:　(ص ۴۲۵ ج ۳)

چند جا ہنگامۂ آویزش گرمی گرفت سر افشانی و جان ستانی آرایش یافت

برآمد ز قلب دو لشکر خروش　　　رسید آسماں را قیامت بگوش
زمیں گفتی از یکدیگر بر درید　　　سرافیل صور قیامت دمید

اور جب کوئی فوجی سردار ہلاک ہو جاتا تو اس کا ذکر اس طرح کرتا ہے:۔

سید ہاشم بارہہ حال سنجی ہشہ جاوید نیک نامی اندوخت　(ج ۳ ص ۴۲۵)

وہ جب بزم آرائی پہ آتا ہے تو بہار کی تصویر کشی اس طرح کرتا ہے۔　(ج ۳ ص ۳۲)

دریں ہنگام سعادت پیرائے اشعۂ رایات سلطان بہار صیقل گر مرآت طبائع شد،
چمن را پرند سوری و پرنیان یمن آئین بستند شمال و صبا خس و خاشاک از گلستان

روزگار درفتند، اعتدال ہوا چوں عدالت شہنشاہی نیرنگ ساز بدائع نگار آمد

و تازگیہائے و نادرہ کاریہائے نو شگفت افزائے جہانیاں شد۔

خواست پریدن چمن از جا بکی	خواست چکیدن سمن از نازکی
باد نویسندہ بدست امید	قصۂ گل بر ورق مشک بید
قافلہ یاسمن و گل بہم	قافیہ گو قمری و بلبل بہم
گر بسلام چمن آمد بہار	گر بستایش بر گل رفت خار
محضر منشور نو لیان باغ	فتوی بلبل شد بر خون زاغ

ابوالفضل کو اسمار کے ساتھ صفات اور اسمائے فاعل لکھنے کا خاص ملکہ تھا، اسکی پوری کتاب میں ایسی مثالیں بھری ہوئی ہیں، مثلاً اورنگ نشینان فرہنگ آرا، بدگوہران ناہنجار، کاخہائے دلنشیں، بستان سراہائے نظر فریب، آبشارہائے سامعہ افروز، پرستش کدہائے شگرف، تیرہ دلان کج گرا، فرزند عفت گزیں، خامۂ عنبریں، کلک گوہریں فیروزی شگرف نشاط افزا، دیدہ وران ژرف نگاہ، جویندگان گم کردہ راہ وغیرہ۔

بعض اوقات قافیہ پیمائی سے عبارت کو رنگین بنا دیتا ہے، مثلاً استشمام گلدستہ بہارستان یکدلی و یگانگی، استطلاع نگارستان دوربینی و فرزانگی، خدیو بزرگ کشور داد گستری، فروزندہ چراغ خانی، فرازندہ چتر کیانی، نفائس حقائق الٰہی و شرائف دقائق آگاہی، خلاصۂ زندگانی و زبدۂ کامرانی صحبت اشباح انسانی و موانست اجسام روحانی وغیرہ،

آئین اکبری میں امور انتظام سلطنت کی ساری تفصیلات موجود ہیں، اس میں شاہی حرم، شکوہ سلطنت، نگیں شاہنشاہی، فراش خانہ، آبدار خانہ، باورچی خانہ، دار الضرب، لشکر، لشکرگاہ، قور خانہ، توپ، بندوق، ہاتھی، گھوڑے، خچر، اونٹ، اصطبل، منصبداری نظام،

کشک، صوبے، حدود صوبے، ان کی تاریخ، وہاں کی آمدنی، پیداوار، میوے، ترخ اجناس، دریا، ندی، نہر، آراضی وغیرہ کے ساتھ معاصر علما، شعرا، ہندوستان کے صوفیائے کرام، اور ہندوؤں کے مذاہب اور عقائد وغیرہ سے متعلق بیش بہا معلومات ہیں، ان تمام خشک چیزوں کے لکھنے میں ابوالفضل کے قلم کی رعنائی اور توانائی میں کوئی کمی واقع نہیں ہوتی ہے، بلکہ اکبرنامہ اس کے اطناب کا شاہکار ہے، تو یہ کتاب اس کے ایجاز کا اعجاز ہے، وہ ایوان سلطنت کی رونق کو نور الٰہی قرار دیتا ہے، جو خداوند تعالیٰ کی طرف سے اس کی رائے کے مطابق بادشاہوں کو عطا ہوتی ہے، اسی لیے بادشاہ شان و شوکت کو تنویر الٰہی کا مظاہرہ سمجھ کر انکے دلدادہ ہوتے ہیں، وہ گویا بادشاہ کو ظل الٰہی قرار دیتا ہے، اس نازک بحث کو اس اختصار کے ساتھ اس طرح قلم بند کر جاتا ہے،

شمۂ چہار طاق فرمانروائی فرۂ ایزدیست کہ بے میانجی کوششہائے امکانی دست نہاد ایزدی قدرتست اورنگ نشینان فرہنگ افزا بصورت آرائی دل برنہند و آں را چہرہ کشائے ایزدی فروغ پندارند (آئین اکبری ج ا ص ۲۹)

اکبر دین الٰہی قائم کرنے کے بعد چراغ کی بھی پرستش کرنے لگا تھا، ابوالفضل نے اس کی انشاپردازانہ توجیہ اس طرح کی ہے کہ جہاں پناہ اپنی روشن ضمیری سے روشنی کو بیحد عزیز رکھتے ہیں، اس کی تعظیم کو خداپرستی اور ستایش سمجھتے ہیں، لیکن نادان اس کو آذرپرستی سمجھتے ہیں۔

گیہان افروز روشن دل نور دوستی را ایزدپرستی شمارد و ستایش الٰہی اندیشد نادان تیرہ خاطر داد از فراستی و آذرپرستی خیال کند۔ (ج اول ص ۲۸)

روزانہ آفتاب غروب ہونے کے بعد چراغ روشن کیا جاتا تو اکبر کی موجودگی میں

بھجن بھی گایا جاتا۔ اس طرح اس کی پرستش کر کے اکبر کی دولت اور نور معرفت کے لیے دعائیں مانگی جاتیں۔ ابوالفضل اس عبادت کا ذکر ان الفاظ میں کرتا ہے :

دروازہ لگن ہاے زریں و سیمیں کافوری شمعہا افروختہ در پیشگاہ حضور آورند و یکے از سرایندگان شیوا زبان شمع در دست ایزدی سپاس می گزارد و گوناگوں نمط سرایدو پس دعاے دولت روز افزوں برخواند و اتمام سخن بداں کند گیتی خدیو نیایش و نیاز را پایہ برتر نہد و تازہ فروغے دریوزہ کند۔ (آئین اکبری ج ا ص ۲۹)

ہندوؤں کے تسخیر قلوب کی خاطر اکبر گائے کی طرف بھی مائل ہو گیا تھا۔ ابوالفضل بھی گائے کو مایۂ روزگار قرار دیتا ہے۔ اور جب اکبر کے حکم سے دیوالی کے روز گائیں آراستہ پیراستہ ہو کر اس کے سامنے پیش کیجاتیں تو ابوالفضل اس کو اس طرح بیان کرتا ہے:

بفرمایش شہنشاہی لختے آراستہ بنظر ہمایوں در آورند و عید دلہا شود (آئین اکبری ج ا ص ۱۱۲)

اسی ایجاز کے ساتھ وہ اکبر کے عقیدۂ تناسخ اور آفتاب کی پرستش وغیرہ کا بھی ذکر کر جاتا ہے جس میں اس کی شاہانہ سطوت و عظمت کو برابر قائم رکھنے کی کوشش کرتا ہے۔

وہ آئین اکبری میں اسی اختصار کے ساتھ ہر چیز کو بیان کرتا ہے، پھولوں کی خصوصیات بھی چند سطروں میں ذکر کر کے ماہر نباتات کے لیے قیمتی معلومات فراہم کر دیتا ہے، مثلاً کیسو کے متعلق یہ کہنا چاہتا ہے کہ اس میں پانچ پنکھڑیاں ہوتی ہیں، ہر پنکھڑی شیر کے ناخن کے مانند ہوتی ہے، اس کے بیچ میں زرد ریشہ دار تولیدی شاخچہ ہوتا ہے، جس کی شکل زبان کی سی ہوتی ہے، اس کا درخت بہت بڑا ہوتا ہے، اور اس قدر پھولتا ہے کہ تمام عالم کو آتشیں روشنی سے روشن کر دیتا ہے۔ تو اس کو چند فقروں میں ادا کر جاتا ہے

کیسو پنج برگ ہر برگے بناخن شیر ماند زبانۂ زردی درمیان، درخت او بس بزرگ باشد

و صحرا صحرا بشگفد و جہاں را جامۂ آتش درگیرد (ج اول ص ۴۴)

اسی ایجاز کے ساتھ وہ ہندوؤں کے مذہبی فلسفیانہ خیالات مثلاً ویشیشک، میمانسا، بیدانت، سانکھ، پاتنجل، کرم بپاگ وغیرہ کو بیان کر گیا ہے جس کے بعد یہ کہا جا سکتا ہے کہ البیرونی کے بعد اسی نے مسلمانوں کو ہندوؤں کے مذہبی عقائد، مراسم اور تہواروں کو زیادہ سے زیادہ روشناس کیا، اور ہندوستانی موسیقی کو جس طرح اس نے اپنی اس کتاب میں پیش کیا ہے، وہ بھی اس کی انشاء پردازی کی ایک اعلیٰ مثال ہے،

اس کو نئی نئی اصطلاحات بنانے میں خاص ملکہ تھا، مثلاً تفریحی کھیلوں کو وہ نشاط بازی، کبوتر بازی کو عشق بازی کہتا ہے، حکومت کے امراء کے لیے بزرگان جاوید دولت، دربار کے علماء و فضلاء کے لیے دانش اندوزان جاوید دولت، شاہی اطباء کے لیے پزشکان، شعراء کے لیے قافیہ سنجان، ارباب نغمہ کے لیے خنیا گران کی اصطلاحات استعمال کرتا ہے،

ابوالفضل کے انشاء میں سبک ہندی کو نیچی نظر سے دیکھنے والے بہت سے نقائص نکال سکتے ہیں، لیکن یہ کہنا بھی صحیح ہوگا کہ اس کی انشاء پردازی کی چڑھی ہوئی کمان کو زہ کرنے والا شاید ہی کوئی پیدا ہو سکا، اور اسی انشاء پردازی کی بدولت اس نے اکبر کو وہ مقام عطا کر دیا، جو اس کے معاصر حکمرانوں میں کسی کو حاصل نہ ہو سکا، اس کی مغلق، مکلف اور مزین عبارت آرائی کو بعض لوگ پسند نہ کریں گے، لیکن اس کے بعد بہت سے انشاپردازوں اور مورخوں نے اسکی نقل کرنے کی کوشش کی، مگر کوئی اس کی اصل کو نہ پہنچ سکا، اور اس کے طرز بیان کو بھاری پتھر سمجھ کر، صرف چوم کر چھوڑ دیا۔ وہ خود لکھتا ہے کہ اس کی زندگی ہی میں اس کی کتاب کی ستائش بھی ہوئی، نکوہش بھی،

اس پر آفریں بھی ہوئی اور نفریں بھی، جو تقلید کے پرستار نہ تھے، بلکہ چشم بینا رکھتے تھے،
جو سخن دلپذیر کو پسند کرتے اور دل سخن پذیر رکھتے، انھوں نے تو اس کی تعریف کی،
جس سے وہ خوشی میں سرشار رہا، مگر شورش پسندوں اور حاسدوں نے طنز بھی کیا،

من خاک رہ گرشناساں — کامروز برغم ناسپاساں
ایں گنج گہر چو بر کشادند — انصاف گزیں نظر کشادند

اس کے بعد ایک دیدہ ور خیر اندیش دوست نے اس سے کہا کہ اس کتاب کے
لکھنے میں اتنی زحمت کیوں کی، اور ایسا طرز انشاں کیوں اختیار کیا جس کو ہزاروں
میں سے صرف ایک ہی صحیح طور سے پڑھ سکے گا، کون اس کتاب کی حقیقت شناسی کر سکے گا،
کون اس کی بلند پائگی کی داد دے سکے گا، اس لیے بہتر ہے کہ اس نئے طرز کی بساط کو الٹ کر
زمانہ کی زبان میں لکھو تاکہ عوام بھی اس سے فائدہ اٹھائیں، ابوالفضل نے اس کا جواب
دیا اس کا خلاصہ یہ تھا کہ اس نے جو کچھ لکھا ہے، وہ عوام کے لیے نہیں ہے، اس کی تحریر
ایک آسمانی ارمغان ہے جو صرف خواص کے لیے ہے،

غلیوازرا باکبوتر چہ کار
بازملک در خور است ایں شکار

گلزارِ وحدت

از

شاہ تراب چشتی

از جناب ڈاکٹر نور السعید اختر صاحب، ایم اے، پی، ایچ، ڈی بمبئی

قدیم اردو کی ابتداء صوفیائے کرام اور مشائخ عظام کے ہاتھوں ہوئی، اسی لیے
اردو کا ابتدائی ادب تصوف کی گلکاریوں سے مزین ہے، دکن میں ان بزرگوں نے نہ صرف
اسلام کی توسیع و تبلیغ کے لیے ایک عام فہم زبان کی داغ بیل ڈالی بلکہ غیر مذاہب کی متبرک
کتابوں کا بھی بغور مطالعہ کیا اور ان کی اچھی باتوں اور ان کے فلسفہ و عقائد کو نظم و نثر
کے سانچوں میں ڈھال کر ایک نئے انداز فکر کی بنیاد ڈالی،

اس تحریک کے اولین بانیوں میں شاہ علی جیوگام دھنی (متوفی ۹۷۳ھ/۱۵۶۵ء) قرار دیے
جاسکتے ہیں، انھوں نے ہندی اور اسلامی مصطلحات کو پہلی بار اپنے دیوان "جواہر اسرار اللہ"
میں جگہ دی اور "رام" و "رحیم" کے تصور کو یگانگت کا جامہ پہنایا، ان کے بعد "سکھ انجن" کے شاعر
سید میراں شاہ ابوالحسن قادری اور مثنوی "من لگن" کے مصنف بحری کے یہاں ان ہی
خیالات کی بازگشت سنائی دیتی ہے، ان بزرگوں نے قدیم اردو کے ادبی اور مذہبی
ورثے کو ایک نئی آب و تاب بخشی۔

شاہ تراؔب چشتی بھی اٹھارہویں صدی عیسوی کے اسی دائرۂ فکر کے بزرگوں میں سے ہیں، جنھوں نے ہندی اور اسلامی تصوف کو زیادہ واضح شکل میں پیش کیا ہے، اسلامی تصوف کے انوار جو نویں صدی ہجری سے قبل ہی دکن کو اجالوں کا دیس بنائے ہوئے تھے، شاہ تراؔب اور ان کے پیش رووں کی کوششوں سے اور بھی منور ہو گئے۔

حالات | شاہ تراؔب کے ذکر سے تمام تذکرے خالی ہیں، البتہ ان کی تصانیف کی داخلی شہادتوں کی مدد سے اتنا معلوم ہوتا ہے کہ ان کا نام "تراب علی" اور تخلص "تراؔب"، "ترابا"، "ترابی"، اور "بوتراب" تھا، وہ ترنامل (مدراس) کے رہنے والے تھے، اپنے صوفیانہ مقام کے باعث شاہ تراؔب کے نام سے زیادہ مشہور ہوئے، ان کے والد ماجد عبداللطیف خاں بھی نیک دل اور صوفی منش تھے، شاہ تراؔب نے اپنے والد کے متعلق مثنوی "آئینہ کثرت" میں مندرجۂ ذیل رائے کا اظہار کیا ہے:

نصیری دیکھ سبزواری تھے او | بہ درد جس میں اشک جاری تھے او
نہ مذہب و ملت سے رکھتا تھا کام | تھا مشغول دریادِ حق صبح و شام[1]

شاہ تراؔب کی صحیح تاریخ پیدائش کا علم نہ ہو سکا، البتہ اتنا وثوق کے ساتھ کہا جا سکتا ہے کہ ان کے پیرو مرشد پیر پادشاہ حسینی نے ۱۱۱۵ھ ہجری میں انھیں خرقۂ خلافت عطا کیا تھا، اس واقعہ کا ذکر شاہ تراؔب نے "مثنوی ظہور کلی" کے انیسویں باب میں اس طرح کیا ہے:

او ولیِ عصر مرشد نامدار | در سنِ پنجدہ[2] و یک صد یک ہزار
روز جمعہ ماہِ رجب وقتِ شام | دی خلافت گنج الاسرار بخشے نام

۱؎ آئینہ کثرت: من سمجھاون، ص: ۹ ۲؎ محترمہ ڈاکٹر سیدہ جعفر نے پنجدہ سے پچاس مراد لیے ہیں، در اصل پنجدہ پنج اور دہ کا مرکب ہے، جس سے پندرہ برآمد ہوتے ہیں، دیکھئے من سمجھاون مرتبہ سیدہ جعفر ص ۱۷

شاہ تراب کی تصنیف و تالیف کا سلسلہ ۱۱۵۰ھ تک جاری رہا، اسی سنہ میں انھوں نے مثنوی آئینہ کثرت مکمل کی تھی۔

اس اعتبار سے شاہ تراؔب یقینی طور پر ۲، سال تک بقید حیات رہے، افسوس ہے کہ ان کی تاریخ وفات کے متعلق کوئی اشارہ نہیں ملتا۔

تعلیم و تربیت | شاہ تراب کی ابتدائی تعلیم و تربیت ان کے والدین کے دامن میں ہوئی، اس کے بعد انھوں نے علم و ادب کا اکتساب کیا اور عربی و فارسی میں کمال حاصل کیا، انھیں علم رمل اور نجوم پر بھی قدرت حاصل تھی، ہند و مذہب اور اس کے فلسفے کی کتابیں بھی ان کے زیر مطالعہ رہیں، جیسا کہ انھوں نے خود لکھا ہے

مجھے آکر پڑی یو فکر ایک بار | کہ دیکھوں اہلِ ہند میں کیا ہے تکرار
چلن میں تو بظاہر سب ہیں بے ڈھنگ | سمجھتے ہیں خدا اپنا بتِ سنگ
مگر ان کی کتابوں دیکھنا سب | تو ظاہر سب ہوئیگا ان کا مطلب
پڑا تب سوں ان کی کتاباں | دسیا ہر جا پو او ہی شمع تاباں[1]

چند اشعار اور ملاحظہ ہوں:

غرض کچھ نین تھا ہندی فارسی سوں | اتھا در کار یاراں حمزہ رسی سوں
سگل بید (وید) و پُران کا سیر کیتیا | چہ راماین چہ بھگوت گیتا
ہوا جب ہندوی میں اُس ہ خبردار | تو پایا اصطلاح کا پھیر یکبار[2]

دیگر مذاہب کی کتابوں کے مطالعہ نے شاہ تراؔب کے فکر و فن میں بڑا انقلاب پیدا کیا، انھوں نے ہندی اور اسلامی عقائد و فلسفیانہ مسائل کا تقابلی مطالعہ کیا اور

۱؎ گلزارِ وحدت ص ۳۳۸ تا ۳۴۱ ۲؎ ایضاً ۳۳۲ تا ۳۳۴

اور اس نتیجے پر پہنچے کہ "رام اور رحیم" میں صرف لفظی پھیر ہے، ان کا مفہوم ایک ہی ہے مثلاً

اوہی اللہ اوہی شیو ہری نام　　ہے یک محبوب ہیں جس کے اتنے نام

(گلزار وحدت: ۳۴۴)

شاہ تراب کے پیرو مرشد پیر پادشاہ حسینی کے فیض تربیت نے سونے پر سہاگے کا کام کیا، پیر پادشاہ حسینی کا روحانی سلسلہ شاہ میراں جی شمس العشاق سے ملتا ہے، میراں جی شمس العشاق دکن کے بزرگ ترین صوفیوں میں شمار ہوتے ہیں۔ یہاں یہ بات قابل غور ہے کہ میراں جی شمس العشاق سے لیکر پیر پادشاہ حسینی تک خرقۂ خلافت اسی خاندان کے لوگوں تک محدود رہا، پیر پادشاہ حسینی نے اسے پہلی بار ۱۱۵۰ھ میں شاہ تراب چشتی کے سپرد کیا، جو اس خاندان کے فرد نہیں تھے۔ اس سے شاہ تراب کے صوفیانہ مرتبے کا اندازہ لگایا جاسکتا ہے ؎

نہ کوئی اہلِ دول مجھ پاس آتا　　نہ میں کس پاس جا شیخی جگاتا
نہ قدر و منزلت کس پاس چنداں　　نہ ہے داد و دہش کی اُس چنداں
ہر صورت گذر جائے اوقات　　اپس قسمت اوپر شاکر ہوں دن رات
دمیرے علم کا کوئی قدر داں　　نہ میں پھرتا ہوں سرگرداں و حیراں
اگر جو اہلِ دنیا خر صفت ہے　　اُس عارف سے کیا معرفت ہے
بچھائے اہل باطن کوں اگر داو　　کلاتا کیوں بجا یا کو رکہراو (؟)
نہیں طعنہ کیا کس پر حسد سوں　　مجھے کیا کام کس کے نیک بد سوں[1]

یوں تو شاہ تراب چشتی نے ہر صنف نظم میں طبع آزمائی کی ہے، وہ اپنی ہر نظم میں تصوف کے اسرار و رموز کو سلیس اور عام فہم پیرائے میں سمجھانے کی کوشش کرتے ہیں،

[1] گلزار وحدت ص ۲۲۹ تا ۲۳۵

انھیں چونکہ علم رمل اور نجوم پر پوری قدرت حاصل تھی، اسی لیے انھوں نے علم رمل سے متعلق ایک طویل نظم لکھی ہے جس میں علم رمل کی تمام اصطلاحوں کا استعمال بڑی صفائی اور چابکدستی سے کیا ہے، ان کی غزلیں، قصائد اور متعدد چھوٹی چھوٹی نظمیں بھی اسکی غمازی کرتی ہیں کہ شاہ تراب چشتی کو پیچیدہ صوفیانہ اور فلسفیانہ مسائل کو صاف اور شستہ انداز میں بیان کرنے کا خاص ملکہ حاصل تھا، آج تک شاہ تراب کی اردو کے نثری نمونے دستیاب نہ ہوسکے، البتہ راقم کو انکی فارسی نثر کا ایک اقتباس ملا ہے، جو اس کی دلیل ہے کہ شاہ تراب کو نظم کے ساتھ نثر لکھنے کا بھی شوق تھا، ان کی نثر تکلفات سے عاری ہوتی تھی، ذیل کا اقتباس ملاحظہ کیجیے۔

"روزے مرشدِ حقیقی کعبۂ تحقیق حضرت پیر پادشاہ حسینی قدس اللہ سرہ العزیز در باغِ آشتی جلوس رقص فرمودند وہمہ خلفاء و مریدان در مجلس حاضر بودند، دریں حالت میاں صاحب پسر منعرت گنج بخش سوال نمودہ کہ یا مرشدنا اصل حضرت خمس چہ چیز است، آں قبلہ برحق کعبۂ مطلق ایں غلام می فرمودند کہ اے گنج الاسرار جواب پسر منعرت گنج بخش درباب حضرت خمس بگو۔ غلام موجب حکم سجدہ بجا آوردہ وگفت میاں صاحب اگر عالم غیب کہ می پرسی ایں بیت کافی است :

در گوش تو حلبہ است اذاں دانستم　　کر بنا گوش تر بوسہ زدو آب نشد

[مجموعۂ نظم، نمبر ۲۰۷۷/۹۲ انجمن ترقی اردو علی گڑھ]

تصانیف (۱) **ظہور کلی** :- یہ ایک طویل نظم ہے جس میں بقول شاہ تراب تمام ہندی اصطلاحوں کی وضاحت موجود ہے ؎

ظہور کلی میں اکثر بیاں ہے　　تمام اصطلاح ہندی عیاں ہے

[گلزار وحدت: شعر نمبر ۳۳۱]

اس نظم کا سنہ تصنیف ۱۱۷۱ھ ہے، جیسا کہ شاہ تراب نے خود کہا ہے:

سالِ تاریخ کتاب منجلی   گفت ظہورِ کلّی مولانا علی

اور مقرر پھر کیا نام کتاب   جب ہوا میرے پو فضلِ تراب

(۲) من سمجھاون :- یہ نظم ترکیب بند کے طور پر لکھی گئی ہے، اس کے ہر حصے میں ایک علحدہ موضوع کو نظم کیا گیا ہے، شاہ تراب نے یہ نظم مراٹھی ادب کے مشہور فلسفی اور شاعر رام داس کی مشہور و معروف نظم "مناچے شلوک" کے جواب میں لکھی ہے، اس نظم کا سنہ تصنیف صحیح طور پر معلوم نہیں، داخلی شہادتوں کی بنا پر یہ قیاس کیا جاتا ہے کہ ۱۱۷۱ھ کے آس پاس لکھی گئی ہوگی،

(۳) گیان سروپ[1] :- یہ نظم شاہ تراب نے ترجیع بند کے طور پر لکھی ہے، اس میں ۵۹ بند ہیں، اس نظم میں مختلف موضوعات پر روشنی ڈالی ہے، اور خاص طور پر اپنے پیر و مرشد کی تعریف و توصیف کی ہے، اس نظم کا سنہ تصنیف بھی نامعلوم ہے. البتہ اتنا یقینی طور پر کہا جا سکتا ہے کہ یہ نظم ۱۱۱۵ھ کے بعد تصنیف ہوئی، اس نظم میں شاہ تراب نے کئی سنسکرت الفاظ استعمال کیے ہیں، آخری بند میں اس نظم کے نام کی وضاحت ان الفاظ میں کی گئی ہے:

اے گیان سروپ سب ہوا تمام   بل گیان سروپ اُس رکھا نام

ستگرو سوں دیکھوا سے مدام   ترلوک کا سارا کہا مقام

ہیں عین علی کا صمیم غلام   منج رات ہور دن سب ایہی کام

جو پیر حسینی پیارا ہے

اے تراب اوس بلہارا ہے

(۴) گلزارِ وحدت :- اس نظم کا موضوع تصوف کے اسرار و رموز کی

[1] گیان سروپ از شاہ تراب چشتی مرتبہ ڈاکٹر نور السعید اختر، نوائے ادب بمبئی: جنوری ۱۹۷۰ء

عقدہ کشائی ہے، اس کے چودہ (۱۴) ابواب ہیں، ہر باب کو گل کا نام دیا ہے، اس نظم کا سنہ تصنیف ۱۱۷۳ھ ہے، اور اس کے اشعار کی تعداد ۵۹۸ ہے.

(۵) گنج الاسرار :- یہ ایک طویل نظم ہے، اس میں علم رمل کی باریکیوں کو واضح کیا گیا ہے، مصنف نے اپنے خلیفہ کے حکم سے اس رسالے کا نام گنج الاسرار رکھا، اس کی توضیح انھوں نے یوں کی ہے ؎

بھی اس کا نام رکھ تو گنج الاسرار   گویا سچ نام سوں ہوئے گا اظہار

بجب حکم آں شاہ نکوکار   رکھیا نام اس رسالے کا گنج الاسرار

یہ نظم ۱۱۷۹ھ میں پایۂ تکمیل کو پہنچی، شاہ تراب نے اس نظم کی تاریخ تصنیف بھی کہی ہے.

خرد تاریخ نظم انتخابی   بگفتا گنج الاسرار ترابی

(۶) آئینہ کثرت :- اس مثنوی میں ۱۹۶۰ اشعار ہیں، اور اس کا سنہ تصنیف ۱۱۸۰ھ ہے، اس نظم کا موضوع بھی فلسفہ اور تصوف ہے، لیکن بعض جگہ مصنف نے اپنی نجی زندگی سے متعلق بھی اشارے کیے ہیں، خصوصاً اپنے والد کا ذکر اور اپنے خاندان کے دیگر افراد کے بارے میں بھی چند باتیں لکھی ہیں.

(۷) مثنوی مہ جبیں و ملا :- اس مثنوی کے سنہ تصنیف کا صحیح اندازہ نہیں ہے، اس کے نام کے بارہ میں بھی اختلاف پایا جاتا ہے، اس مثنوی کی ہیروئن کا نام مہ جبیں ہے اور ہیرو ایک ملا ہے، اس لیے اس کا یہی نام زیادہ درست معلوم ہوتا ہے، ڈاکٹر سیدہ جعفر صاحبہ نے اس مثنوی کے اشعار کی تعداد ۶۲۸[1] بتائی ہے، جو صحیح نہیں ہے، راقم اس مثنوی کا مرتبہ متن تیار کر رہا ہے، اس میں اشعار کی تعداد سات سو کے قریب

[1] من سمجھاون، مرتبہ ڈاکٹر سیدہ جعفر ص ۶۸

پہنچ گئی ہے، جو پندرہ حصوں پر مشتمل ہے، اور ہر حصے کا ایک علیحدہ عنوان ہے، شاہ تراب نے اس میں ایک عشقیہ داستان نہایت دلکش پیرایہ میں بیان کی ہے،

(۸) **اپدیش حسینی** :- شاہ تراب کی بعض نظموں کا ایک مجموعہ انجمن ترقی اردو علی گڈھ میں موجود ہے، اسی میں یہ نظم بھی ہے، اس مجموعے کا نمبر ۳۴/۳ ہے، اس میں کل ۸۰ اشعار ہیں، اس میں شاہ تراب نے حروف تہجی کی خصوصیات بیان کی ہیں، کہتے ہیں ؎

ترآب بست و ہشت حروف کا بیاں کیا ہو سارا — ہر یک بیت میں ہر ایک بیت کا مطلب ہیگا نیارا

اس نظم کے مقطع میں شاہ ترآب نے نظم کے عنوان اور وجہ تصنیف کی طرف اس طرح اشارہ کیا ہے ؎

جس گرو کا رن ہو بیراگی ترآب پھرے پردیس — سگرو میرے پیر حسینی جن کا سب اُپدیش

(۹) **نظم خاندانِ چشتیہ** :- یہ نظم دو حصوں میں منقسم ہے، پہلا حصہ "نظم خاندان چشتیہ" پر اور دوسرا "چہار پیر اور چودہ خانوادہ" پر مشتمل ہو، پہلے حصے میں شاہ تراب نے حمد و نعت کے بعد حضرت علی کرم اللہ وجہہ کی تعریف و توصیف میں چند اشعار ہیں، پھر اپنے خاندان چشتیہ کے تمام بزرگوں کا یکے بعد دیگرے ذکر کیا ہے، اس نظم کے پہلے حصہ کو شاہ ترآب نے اس شعر پر ختم کیا ہے ؎

چار پیر خاں دادی بول — اے تراب وصف میں زباں کھول

اس نظم کے ابتدائی حصے میں چار پیروں اور اس کے بعد میں خانوادوں کا ذکر ہے، اس میں اشعار کی تعداد ۸۸ ہے۔

(۱۰) **دو چھوٹی نظمیں** :- (۱) اس نظم کو راقم نے "سوالات شاہ تراب" کا عنوان دیا ہے، اس نظم کے اشعار کی تعداد سترہ۱۷ ہے، اس میں شاہ ترآب نے پیر و فقیر سے سوالات

کیے ہیں، جیسا کہ وہ خود کہتے ہیں :

مطلع: سب پیر ہور فقیر یو میرا سوال ہو — کل شے اوپر محیط سو کیوں ذوالجلال ہے

مقطع: اوہی میرے سوال کا دیویگا خوش جواب — جس کوں ترآب ہو کا میرے وصال ہے

(۲) شاہ ترآب کو علم نجوم پر پوری قدرت حاصل تھی، ان میں علم نجوم کی اصطلاحات کو نظم کرنے کا خاص ملکہ تھا، اس مختصر سی نظم میں جس کے اشعار کی تعداد کل سترہ۱۷ ہے، ہر شعر میں ایک دقیق بات بیان کی گئی ہے، مقطع میں شاہ ترآب نے خود ہی اقرار کیا ہے کہ انھوں نے عاشقِ صادق کے لیے یہ باتیں نہایت اختصار کے ساتھ کہی ہیں۔

طالب صادق کی خاطر اے ترآب — چند ابیات یو کہا ہوں مختصر

غزلیں اور قصائد | شاہ ترآب کی تیس۳۰ کے قریب غزلیں اور چند قصائد بھی ملتے ہیں، غزلوں پر بھی مذہبی اثر موجود ہے، اکثر غزلیں چھوٹی اور مترنم بحروں میں ہیں، شاہ ترآب نے غزل میں اپنے پیر و مرشد کا تتبع کیا ہے، اس لیے غزلوں کے رنگ و آہنگ پر تصوف و معرفت کا اثر غالب ہے، راقم کو شاہ ترآب کی ایک ایسی بھی غزل دستیاب ہوئی ہے جس میں "کرشن جی" کی تعریف موجود ہے، اس غزل کے چند اشعار یہ ہیں ؎

لگا ہے دل مرا اُس سوں کہ جو مرلی مرا ری ہے — سلونا سا نولا دلبر گرِدھر جس کی سواری ہے

چراتا بن میں گو سالے او نند لالنکر کملی پوش — اوسی گوپال مرلی دھر سوں دھن کی کی بیاری ہے

نا ہندو و مسلمان کے او سنیتر اتید میں ہرگز — ترآب مبتلا کے تئیں دیا جو بے قراری ہے

ایک اور خوبصورت غزل کے چند اشعار ملاحظہ ہوں :

رہتا ہوں صبح و شام گرفت رکیف میں — حیرت زدہ ہوں صورتِ دیدارکیف میں

اے زاہد نہ پوچھ مجھے صوم ہور صلوٰۃ — کیا صوم ہور صلوات درکار کیف میں

جب جائیں گے تمام نمازی بروز محشر — میں جاؤں گا بحالت سرشار کیف میں

دی نقد جاں ہوا ہوں خریدار جام مے — پاتا ہوں آج گرمی بازار کیف میں

تب سوں خیال کیف میں رہتا ہوں اے تراب — پایا ہوں جب سے لذت دیدار کیف میں

شاہ تراب نے کسی بادشاہ یا امیر کی مدح سرائی نہیں کی، ان کے تمام قصائد حضرت علیؑ کی تعریف و توصیف سے مالامال ہیں، چند اشعار ملاحظہ ہوں ؎

در پردہ کن گنج نہاں تھا سو علی تھا — پرکار خط مرکز جاں تھا سو علی تھا

جب وحی محمد پہ ہوئی حق سے نازل — جبریل کوں امداد لساں تھا سو علی تھا

باللہ کہ تراب نجف ہے زینت تبریز — از بس کہ اسے امن و اماں تھا سو علی تھا

گلزار وحدت بحیثیت نظم گلزار وحدت سیدھی سادی مگر دلکش متصوفانہ مثنوی ہے، اس کا اسلوب شستہ، شگفتہ اور رواں ہے، خوبصورت استعارے اور نادر تشبیہیں استعمال کی گئی ہیں، کہیں کہیں سنسکرت الفاظ اور ویدانتی فقرے بھی ہیں، کچھ اشعار بحر سے خارج ہیں، اس میں شاہ تراب نے صوفیانہ مسائل کو سلیس پیرائے میں سمجھانے کی کوشش کی ہے، انھوں نے شیخ محمد شبستری (م ۷۲۰ھ مطابق ۱۳۲۰-۱۳۲۱ء) مشہور عالم صوفی کے کلام کے حوالے بھی دیے ہیں،

نمبر شعر

بیاں بولے ہیں صاحب گلشن راز — ہوئے جو معرفت کے فن میں ممتاز [۹۴]

رسد چوں نقطہ آخر باول — در انجا نی ملک گنجد نہ مرسل [۹۵]

تراب بلبل باغ الٰہی — کلام گلشن راز ہے گواہی [۱۳۹]

جہاں انساں شد و انساں جہانے — ازیں پاکیزہ تر نبود بیانے [۱۴۰]

کہے ہیں خوب صاحب گلشن راز — اپس تصنیف میں یو بیت ممتاز [۱۹۱]

سیاہی گر بدانی نور ذات است — بتاریکی درو آب حیات است [۱۹۲]

یہ اشعار اس امر کی غمازی کرتے ہیں کہ شاہ تراب نے "گلشن راز" کا بڑی باریک بینی سے مطالعہ کیا تھا، یہ بھی ممکن ہے کہ انھوں نے "گلزار وحدت" اسی سے متاثر ہو کر لکھی ہو، دونوں تصانیف کے ناموں کے پہلے جز میں ایک گونہ مماثلت بھی پائی جاتی ہے، اس مثنوی میں ایک اور بزرگ میر قنبر شاہ دلدل کا حوالہ بھی ہے، معلوم ہوتا ہے کہ شاہ تراب کو میر قنبر شاہ دلدل سے روحانی لگاؤ تھا، چنانچہ لکھتے ہیں:

کریگا نالہ و فریاد ہر گل — بیاد میر قنبر شاہ دلدل [۵۷۸]

"گلزار وحدت" کے چودھویں گل میں مصنف نے اپنی مثنوی سے متعلق کئی باتیں لکھی ہیں، اس کے نام اور سنہ تصنیف کے ذکر کے بعد کہتے ہیں کہ جو کوئی 'گلزار وحدت' کی سیر کرے گا، اس کو نہ صرف حق اور غیر حق کی تمیز آجائے گی، بلکہ باغ کثرت میں پائے جانے والے نقشہائے رنگ رنگ کی پرکھ کا مادہ بھی پیدا ہوجائے گا ؎

جو ہوے بلبل باغ کثرت — سو پاوے رنگ بوئے باغ کثرت [۵۸۳]

جو لوگ راہ خدا میں گرم سفر ہیں، ان کے لیے گلزار وحدت کا مطالعہ ضروری ہے، اس سے بہت سے اسرار حقیقت اور رموز حیات منکشف ہوتے ہیں، اس ضمن میں شاہ تراب نے شاعرانہ تعلّی سے بھی کام لیا ہے ؎

میرے گلزار وحدت میں اوآوے — جو کوئی عارف باللہ کلاوے [۵۵۱]

شاہ تراب کے نزدیک باخبر دل متاع حیات ہے، وہ اسکی تعریف میں کہتے ہیں:

ہے آدم او جسے دل کی خبر ہے — خبر دل سوں رکھا سو او بشر ہے [۵۷۳]

نہیں او دل جو رکھتے سب بہائم — اہے او دل کہ جس تے عرش قائم [۵۷۴]

حضرت علی کرم اللہ وجہہ سے عقیدت کا اظہار شاہ تراؔب کی ہر مثنوی اور نظم میں موجود ہے، گلزار وحدت میں بھی انھوں نے ان کو خراجِ عقیدت پیش کیا ہے،

الٰہی حب حیدر میں مجھے رکھ　　ہمیشہ یاد صفدر میں مجھے رکھ [۵۸۵]

اگر قالب سوں جی نکلے کا اک بار　　بیادِ حیدرِ صفدر مجھے مار [۵۸۶]

اس مثنوی کے بیشتر اشعار میں شاہ تراؔب نے پیرِ طریقت شاہ امین الدین اعلیٰ بیجاپوری اور اپنے پیر و مرشد پیر پادشاہ حسینی کا بار بار ذکر کیا ہے، اور اپنی عزلت گزینی اور ولیِ عصر ہونے کا دعویٰ بھی کیا ہے،

کلا یا جو امین الدین علی کا　　کیا شہرت جہاں میں کاملی کا [۵۹۰]

ملا جب مرشدِ کامل زبردست　　بجایا تب جہاں میں طبلِ شہرت [۵۹۱]

علم دار امین الدین علی ہوں　　ملامت پیشہ پوشیدہ ولی ہوں [۵۹۲]

ملامت پیشگی ہے عین راحت　　عجب دولت ہے باللہ کنج عزلت [۵۹۳]

ہوا ہوں گنج الاسرار حسینی　　غلامِ کفشِ بردارِ حسینی [۵۹۴]

شاہ تراب نے اپنی تمام مثنوی میں یہ اہتمام کیا ہے کہ ہر گل کے خاتمے پر اپنا تخلص لکھا ہے، اور "اگلے گل" کا تعارف بھی کر دیا ہے۔ قرآنی آیات اور اقوال کے جابجا حوالے بھی دیے ہیں جس سے ان کا اندازِ بیان پرزور اور نظریات واضح ہو گئے ہیں۔ گلزار وحدت میں مندرجۂ ذیل ضرب الامثال استعمال ہوئی ہیں:-

(۱) بلا کے بھول پان دائی کے سر پر [۳۹۷]

(۲) باندر کی بلا طوطے کے سر [۴۲۳]

(۳) خر بے دم سراپا گوہ دگر ہے [۵۵۳]

چند مشکل الفاظ اور تراکیب جن کی تشریح ضروری ہے

الفاظ	معنی	شعر نمبر	الفاظ	معنی	شعر نمبر
۱۔ استھول [سریر]	جسم عنصری	۶۹	۱۵۔ گند، رس، روپ، اسپرش، شبد	حواس خمسہ	۳۲۷
۲۔ سچنجل	آئینہ	۹۶	۱۶۔ نبھل	آسمان	۳۵۸
۳۔ کرتار	خدا	۱۸۰	۱۷۔ چندر	چاند	〃
۴۔ پران	نفس امارہ	۳۲۲	۱۸ بھان	سورج	〃
۵۔ اپان	نفس لوامہ	〃	۱۹۔ اونکار	ادم۔ مبارک لفظ	۴۰۳
۶۔ ویان	ظاہر و باطن	۳۲۳	۲۰۔ جرامرن	جوانی اور بڑھاپا	۴۰۴
۷۔ سمان	نفس مطمئنہ	〃	۲۱ ورن	رنگ	〃
۸۔ اودان	نفس ملہمہ	〃	۲۲ کرپا	مہربانی	۴۳۶
۹ کنٹھ	حلق	〃	۲۳ بلہار	قربان	〃
۱۰ اپدیش	پیغام	۳۲۵	۲۴ دیاونت	رحم دل	۴۳۸
۱۱۔ ستگر	مرشد کامل	〃	۲۵۔ نت سنت	ہمیشہ اچھا رہنے والا	〃
۱۲۔ دس اندریہ	پانچ کرم اندری، پانچ گیان اندری	۳۲۶	۲۶۔ تربھون	سورگ، پرتھوی اور پاتال	۴۴۱
۱۳۔ پنج پران	پانچ حواس ظاہری	〃	۲۷۔ جوتی سروپ	ایک دیوی کا روپ	〃
۱۴۔ من بدھی	عقل کل و نفس کل	〃			

جدید لسانیات کے ماہرین نے اٹھارہویں صدی عیسوی کی قدیم اردو کا لسانیاتی تجزیہ کر کے جن اہم باتوں کی طرف اشارہ کیا ہے وہ سب کی سب گلزار وحدت میں موجود ہیں۔

گلزارِ وحدت کا خلاصہ

مثنوی گلزارِ وحدت کی ابتدا تصوف کی روایتی مثنویوں کی طرح حمد سے ہوتی ہے۔ اس میں رازِ کُن، اور اسرارِ "ف کاں" کی تشریح کے ساتھ ساتھ وحدت، واحدیت اور احدیت کے مسائل کی توضیح بھی موجود ہے، نورِ احمد اور میم محمد کی احادیث اور وجودِ آدم کے ظہور کی اہمیت پر بھی بحث کی گئی ہے، وجودِ آدم سے متعلق شاہ تراب کا خیال ہے کہ ؎

وجود ہے ذاتِ واجب یعنی اصفات ۔۔۔ وجود کا وصفِ خاص ہے اعتبارات [۲۲]

وجود علم و نور و ہم شعور ہے ۔۔۔ یو وصف خاص اور واجب وجود ہے [۲۷]

دوسرا "گل" موم کی تمثیل اور وصف موم پر مبنی ہے، موم سے کئی چیزیں بنائی جاتی ہیں، اس کی ساخت اور شکل میں تبدیلیاں ہوتی رہتی ہیں، لیکن اس کی صفات جوں کی توں رہتی ہیں، ؎

یکے خشکی دویم لون جان گرمی ۔۔۔ سیوم سختی چہارم بوجہ نرمی [۳۷]

جس طرح موم کی مختلف شکلوں سے موم کے وجود میں کوئی فرق نہیں آنے پاتا، اسی طرح ذاتِ حق کے جلوے ساری دنیا میں مختلف شکلوں اور صورتوں میں نمایاں ہیں، لیکن اسکا وجود اپنی جگہ قائم ہے۔ شاہ تراب نے اس "گل" میں وحدت کے تصور کو سیدھے سادے انداز میں پیش کرنے کی کوشش کی ہے۔ اس کے بعد سونے کی مثال دی ہے کہ زرگر سونے کی الگ الگ چیزیں بناتا ہے جس سے اس کی شکلیں بدلتی رہتی ہیں، لیکن سونے کی صفات جوں کے توں قائم رہتے ہیں۔

تیسرے "گل" میں "ہفت اصفاتِ قادر" کا تعارف کرایا ہے، اسے "سبعہ صفات" بھی کہتے ہیں، اس میں بتایا گیا ہے کہ حق شناس کے لیے عقل کی رہنمائی درست نہیں بلکہ اس

کے لیے جذبۂ عشق ضروری ہے، اسی کی مدد سے وہ حقیقت و معرفت تک پہنچ سکتا ہے، البتہ ایک مرشد صادق کی دستگیری ضروری ہے، اس کے بعد روحِ ناطق کی باریکیوں کو سمجھانے کی کوشش کی ہے، اور بتایا ہے کہ روحِ ناطق دراصل "تجلی" کا دوسرا نام ہے اور اسی سے عقل وجود میں آئی ہے ؎

تجلّی قدیر ام الدماغ ہے ۔۔۔ کہ انساں میں دماغ عین فراغ ہے [۷۸]

اس کے بعد "تجلیِ علیم"، "تجلی کلیم"، "تجلی مرید" کے نام سے علم ثلاثی بیان کیے ہیں، وہ کہتے ہیں علم ثلاثی ہر جگہ موجود ہے ؎

ہر ایک شے میں ثلاثی علم جانو ۔۔۔ بجز ان کے نہیں ہے کچھ پچھانو [۸۱]

علم ثلاثی کی توضیح ذیل میں کی گئی ہے ؎

سمجھ علم ثلاثی اے برادر ۔۔۔ خدا، او نور قدرت بوجہ اکثر [۸۰]

موجوداتِ دنیوی نورِ احمد کی برکت سے وجود پذیر ہوئے ہیں، محمدؐ دراصل نورِ حق ہیں، پھر اس کی تشریح کی گئی ہے کہ نورِ احمد نے کس طرح عناصرِ خمسہ کا قالب اختیار کیا اور ان کا ایک دوسرے سے کس طرح تعلق پیدا ہوا۔

گل چہارم "حق و حقیقت اور وحدت و کثرت" کی تفصیلات پر مشتمل ہے، اس میں وحدت و کثرت کی حقیقت و ماہیت سمجھائی گئی ہے ؎

تجلی اول کا نام ہے وحدت ۔۔۔ تجلی ثانی یعنی واحدیت [۱۳۳]

یہی انسان اول وحدت ہے نام ۔۔۔ سمجھ انسان ثانی کثرت نام [۱۳۴]

گل پنجم میں بتایا گیا ہے کہ انسان جو ایک ادنیٰ سی مخلوق ہے، اس نے اطاعت خداوندی کا بار اپنے سر لے لیا، جس کو اٹھانے کی عرش و فرش پر کسی نے بھی ہمت نہیں کی،

اس لیے انسان قابلِ ستایش ہے کہ اس نے جرأت سے کام لیکر فرشتوں کو بھی مات دی،
لیکن اب وہ لذاتِ دنیوی میں مشغول ہو کر ناکارہ ہو گیا ہے ۔

اَرے او بے خبر بے ہوش مجہول — امانت داری کیوں اپنی گیا بھول [۱۵۲]

اسی گل میں آگے چل کر بتایا ہے کہ مکر و فریب نے مذہب کی حقیقی روح پر ریاکاری
کے پردے ڈال دیے ہیں، اس لیے مجاہدے اور مجاہدے کو فراموش کرنے والے حقیقت
تک کس طرح پہنچ سکتے ہیں؟ ان کے نزدیک سب سے بڑا پردہ علم ہے، کیونکہ اہلِ علم
صرف و نحو، حکمت و نجوم اور رسمی علوم کی تحصیل میں حیران و سرگرداں رہتے ہیں، اس لیے
حقیقت تک ان کی رسائی کس طرح ہو سکتی ہے ۔

السّعی مِنّی کا حوالہ دیتے ہوئے کہتے ہیں کہ بشر کے لیے نورِ ایمان کی خبر ضروری ہے،
اگر اس پر جسمانی کثافتیں غالب آگئیں تو اس کے نفس پر شیطان سوار ہو جاتا ہے، اہلِ ایمان
کے لیے وحدت سے سرشاری ضروری ہے، اس سے قربِ الٰہی حاصل ہوتا ہے ۔

اگر او کیف ہوئے سب کے دل میں — دِسے کیفِ الٰہی آب و گل میں [۱۷۸]

چھٹا گل "شیخِ جاہل" سے متعلق ہے، اس میں نام نہاد پیروں اور مریدوں کی حقیقت
ظاہر کی ہے۔ اور مرشدِ کامل اور اس کی خصوصیات کو پیش کر کے جاہل پیروں کی کوتاہیوں
کو بیان کیا ہے، جو اس زمانہ میں عام تھیں، ان کے نزدیک پیرِ کامل کی تلاش آسان نہیں
ہے، اس کے لیے مرید کو صحرانوردی کرنی پڑتی ہے اور اصل و نقل کی پہچان کے لیے دیدہ وری
سے کام لینا پڑتا ہے، ورنہ نقلی پیر شعبدہ بازی کے ذریعے کم عقل مریدوں کو اپنا گرویدہ
بنا لیتے ہیں، شاہ تراب نے ایسے پیرانِ جاہل کو پنڈاریوں سے تشبیہ دی ہے جن کا پیشہ لوٹ مار ہے ۔

دھریں جرأت عجب اوصافِ ذات — پنڈاری لشکر سا ہو کی ہے مات [۲۲۶]

ان کے نزدیک وہی شخص پیرِ کامل کہلائے جانے کا مستحق ہے جس کے آبا و اجداد
بھی عارف باللہ رہ چکے ہوں، وہ کہتے ہیں ۔

سزاوار ہے او سے پیر کا مسند — کہ جس کا معتبر مشہور ہے جد [۲۴۲]
او البتہ اچھیگا پیر کامل — ہوا ہے جد و آبا جس کا واصل [۲۴۳]

ساتواں گل وجود ذاتِ مطلق پر ہے، اس میں وجودِ انسانی اور ضرورت تن کی
پیچیدگیوں پر روشنی ڈالی ہے، اس ضمن میں انھوں نے بزرگانِ طریقت اور
صوفیائے کرام کی سندیں پیش کی ہیں، مثلاً میراں جی شمس العشاق کے حوالے سے کہتے ہیں:

وے واجب وجود کرلے عزیزاں — کہے اس تن کوں حضرت شاہ میراں [۲۵۹]
یو تن واجب لگر بولے جو حضرت — بیاں کرتے ہیں علما ساری حجت [۲۶۰]

اسی گل میں میراں جی شمس العشاق اور ان کے خلفا کا شجرہ بھی بیان کیا ہے، اس
شجرے میں شاہ برہان الدین جانم، امین الدین اعلیٰ، بابا شاہ حسینی، حضرت علی پیر
اور پیر پادشاہ حسینی شامل ہیں، اس گل کا اختتام اس شعر پر ہوتا ہے ۔

تراب نقش پائے آں ولی ہے — کہ جس کا جد امین الدین علی ہے [۲۸۳]

گل ہشتم ارواح اور اجسام کے ذکر پر مشتمل ہے، اس میں عالمِ کثیف اور ناپاک
اجسام پر بحث کی ہے، عالم کے اقسام گنائے ہیں، اور اقسامِ ارواح کی تشریح
کی ہے، مثلاً ۔

کہے نامیہ دوئم متحرک جان — سیوم ناطق چہارم قدیر پہچان [۲۹۸]

اسکے بعد خانۂ قلب میں رہنے والی چاروں روحوں کی تفصیل پیش کی ہے ۔

اہے روحِ نباتی در جگر جان — ہے در گردہ جمادی روح پہچان [۳۰۹]

سچ توں روحِ حیوانی کوں ہے دل
دماغ میں روحِ انسانی ہے داخل [۳۱۰]

بدن میں روحِ انسانی اہے سب
ولیکن ہے سراپا صنعتِ رب [۳۱۱]

گل نہم نظریۂ ہمہ اوست کی وضاحت پر ہے، اس میں روحِ جمادی اور روحِ نباتی کی تشریح کی گئی ہے، جگر میں رہنے والی روح کو 'نباتی' گردہ میں رہنے والی رُوح کو 'جمادی' دماغ والی کو 'نفسانی'؛ اور دل میں بسنے والی رُوح کو 'روحِ حیوانی' بتایا ہے۔ اس گل میں انھوں نے اہلِ ہنود کی کتابوں سے بھی استفادہ کا اعتراف کیا ہے، اور عناصرِ خمسہ اور حواسِ خمسہ کے سنسکرت مترادفات شامل کیے ہیں،

غرض کچھ نیں تھا ہندی فارسی سوں
اتھا در کارِ یاراں جز رسی سوں [۳۳۲]

سگل بید و پران کا سیر کیتا
چہ راماین وچ بھگوت گیتا [۳۳۳]

دسویں گل میں "کل شئ محیط" کی تشریح ہے۔ شاہ تراب کا نظریہ یہ ہے کہ خدا ہر جگہ حاضر و ناظر ہے، وہ آفاقی ہے، ان کے نزدیک جلوۂ معبود دیر و کعبہ، زاہد و پجاری اور مفلس و غنی سب کے دل میں ضو فشاں ہے، اس سلسلہ میں ان کے یہ اشعار غور طلب ہیں ؎

کہیں بلبل کہیں گل ہو کہیں مل
کہیں شیشہ کہیں آوازِ قلقل [۳۵۴]

کہیں ساقی کہیں ساغر کہیں دور
کہیں عاشق کہیں معشوق پر جور [۳۵۵]

انھوں نے انساں کو "سرِّ حق" اور حق کو "سرِّ انساں" بتاتے ہوئے حقیقت، واحدیت، حق احد اور وحدت وغیرہ کی تشریح کی ہے، اور 'احد' کو "اصل اشیاء" بتایا ہے، چنانچہ کہتے ہیں ؎

احد ہے اصل اشیا اے برادر
بھی واحد اصل تعدادِ مشور [۳۷۰]

گیارہواں گل اسمائے محمدیؐ اور آدمِ حقیقی کے ذکر میں ہے، اس میں آدم کی ان خصوصیات کا بیان ہے جس کی وجہ سے اس کو فرشتوں پر فوقیت دی گئی ہے،

بارہویں گل میں "ذکرِ یگانگی اور عبد معبود" کا بیان ہے، اس بتایا گیا ہے کہ انسان خدا میں واصل بھی ہے اور اس سے جدا بھی، جیسے لفظ میں معنی پنہاں ہوتے ہیں لیکن دونوں جدا بھی ہیں

سچ تو بشر میں یوں خدا ہے
نہیں جوں حرف سوں معنی جدا ہے [۴۲۵]

پھر بتایا گیا ہے کہ انسان کمزور و ناتواں ہے، محض لطف الٰہی سے اشرف المخلوقات کے اعلیٰ و ارفع مقام پر فائز کیا گیا، اس کا سبب وہ جرأت بھی تھی جو فرشتوں کے مقابلہ میں دکھائی،

فرشتوں میں نہیں تھا تابِ طاقت
اٹھا لیوں جو اد بارِ امانت [۴۵۴]

تیرہویں گل میں آیۃ النور کا بیان ہے، اس میں قلب انسانی کی اہمیت بتائی گئی ہے، عارفِ کامل کا دل درگاہ الٰہی سے کم نہیں لیکن دل کا سمجھنا بہت مشکل ہے ؎

ہے تیرے روبرو دل توں ہے بیدل
سمجھنا دل کے تئیں سب کچھ ہے مشکل [۵۲۰]

دل کے رازہائے مخفی کو سمجھنے کے لیے مرشد کامل کی دستگیری کی ضرورت ہے ؎

سمجھنا دل کوں کارِ بوالہوس نیں
بجز مرشد تو عرفاں کچھ ہوس نیں [۵۲۸]

اول درکار ہے مرشد تو کامل
کرے ارشاد سوں جو واقفِ دل [۵۳۰]

مکاشفِ دل کوں پانا کچھ سہج نیں
بجز مرشد تو بھی دیگر سہج نیں [۵۳۱]

اگر مرشد ملا ہے تجھ کوں کامل
تو البتہ ہوا ہے صاحبِ دل [۵۳۲]

چودھواں گل خاتمہ انساب (در اختتام کلام) پر مشتمل ہے، اس میں مصنف

نے مثنوی کے نام اور سنہ تصنیف کی صراحت کی ہے، شاہ تراب عارف کامل تھے، اسلیے اپنی مثنوی کا نام بھی اسی مناسبت سے منتخب کرنا چاہتے تھے ایک مرتبہ تمام رات اسی فکر میں غلطاں رہے، بالآخر ہاتفِ صبح نے یہ صدا دی ؎

دیا آواز ہاتفِ صبح یک بار کہ ہے گلزارِ وحدت گنجِ الاسرار [۵۳۷]
یکایک جو سنا ہاتف کا آواز رکھا "گلزارِ وحدت" اسم ممتاز [۵۳۸]
ہزار و یک صد و ہفتاد و سہ سن ۱۱۷۳ھ مرتب جب ہوا گلزارِ روشن [۵۳۹]

مثنوی کا اختتام ان اشعار پر ہوتا ہے ؎

جو ہے بو طالبی سو بو ترابی ہوا شیرازۂ ختم کتابی ۵۹۷ تا
تراب نقش نعلین حسینی کیا ختم سخن رسمی و عینی [۵۹۸]

سلسلۂ تجدید دین

مرتبہ مولانا عبد الباری صاحب ندوی

جامع المجددین:- اس میں ہر طرح کی دینی و دنیوی فلاح و صلاح کے لیے بہت آسان اور کارگر تدبیریں بتلائی گئی ہیں جن پر عمل کرنے سے ایک انسان پورا مسلمان اور دیندار بن سکتا ہے، ۸ر

تجدید تصوف و سلوک:- اس میں تصوف کے متعلق ہر قسم کی علمی و عملی غلطیاں اور غلط فہمیوں کو دور کر کے بتایا گیا ہے کہ حقیقی تصوف درحقیقت کمال اسلام اور کمال ایمان ہی، اور بغیر اہل دل صوفی بنے اسلام کی دنیوی و اخروی برکات و ثمرات کا حصول انسان کے لیے ناممکن ہے۔ صر

تجدید تعلیم و تبلیغ:- خالص اسلامی بنیاد پر خیرامۃ بنانے کا ایک نسخہ کیمیا۔ ۶ر

تجدید قومیات و سیاسیات، تجدید معاشیات، صر

یہ تمام کتابیں مہتمم تجدید دین ہنستان قدم رسول، ہارڈنگ روڈ، لکھنؤ و مکتبہ دار المصنفین (شبلی اکیڈمی) شہر اعظم گڈھ سے مل سکتی ہیں۔

ادبیات

مثنوی

"کاروانِ حیات"

از جناب وحید الدین خاں ایم اے فتحپور

نظر دیکھتی ہے طلسمِ حیات فریبِ نظر رونقِ کائنات
حقیقت میں ہے زندگی اک حباب نمایش یہاں کی مکمل سراب
پلائے مجھے وہ مئے خانہ ساز کہ ہو جائے دنیا سے دل بے نیاز
ان اشکوں کو چنگاریاں بخش دے نفس کو شرر باریاں بخش دے
خرد نے حقیقت پہ ڈالا نقاب جنوں سے ہے حسنِ ازل بے حجاب
رہیں دیدہ و دل حقیقت پسند تجسس سے نظریں رہیں سربلند

رہے دل میں روشن تمنا کا داغ
رہِ عاشقی کا یہی ہے چراغ

رہِ عشق کا رہنما دل رہے نگاہوں میں ہر وقت منزل رہے
رہے تیز رو کاروانِ حیات اسی سے ہے پایندہ رنگِ ثبات
تگ و تاز سے زندگی تازہ دم بڑھاتی ہے منزل کی جانب قدم
تجسس سے اسرارِ فطرت کھلے بہت رازہائے حقیقت کھلے
نظر ہو نہ جائے مظاہر پرست رکھو ذکرِ محبوب سے دل کو مست
دکھاتا ہے دل سرحدِ آرزو اسی سے ہوئی کامراں جستجو

عطا ہو محبت کا ذوقِ بلند
ستاروں سے آگے جو پھینکے کمند

محبت سے کھلتا ہو رازِ حیات — محبت سے پیدا ہوئی کائنات

محبت سے دامانِ گل چاک چاک — محبت سے ہے زندگی تابناک

محبت سے آنکھوں میں اشکِ رواں — محبت سے انساں میں تابِ تواں

محبت سے پیدا ہے سوزِ دروں — محبت سے بجتا ہے سازِ دروں

محبت سے سازوں میں آواز ہو — محبت سے ہی ذوقِ پرواز ہے

محبت سے ہے تیزیِ فکرِ بلند — محبت سے یزداں اسیرِ کمند

محبت سے روحانیت کا فروغ — محبت سے انسانیت کا فروغ

محبت ہے سرمایہ دارِ جہاں — محبت ہے معمارِ کون و مکاں

محبت سے ہوتی ہے دل میں خلش — محبت سے ذروں میں پیدا کشش

محبت سے تحقیق کو ناز ہے — محبت ہی تخلیق کا راز ہے

محبت سے پائندہ ہستی کا جام
محبت سے ہے زندگی کو دوام

رہے گرمِ نالہ برنگِ جرس — نہ دے دل نہ دے فرصتِ یک نفس

اسی درد سے ہو فروغِ نظر — اسی سے رہے دل میں ذوقِ سفر

تخیل دکھائے حسیں مرغزار — تصور میں کھلتے رہیں گل ہزار

گلوں سے ہی گلشن کی آبادیاں — چمن سے رہیں دور بربادیاں

چمن میں رہے ہر طرف نو بہار — لبھائے دلوں کو گلوں کا نکھار

قریں گل کے بلبل چہکتا رہے — یونہی باغ سارا مہکتا رہے

امنگیں بڑھائے شعاعِ امید
امیدوں سے ہر روز ہو روزِ عید

بنا پھر اخوت کی ہو استوار — شعارِ نبی ہو ہمارا شعار

کدورت سے ہر فرد کا دل ہو پاک — خلوص و محبت سے ہو تابناک

عمل سے ہمارے یہی ہو عیاں — کہ مسلم نہیں ہے اسیرِ زماں

یقیں سے ہو ایمان پائندہ تر — ہو امروز سے فردا تابندہ تر

خودی سے ہو پیدا دلوں میں سرور — رہیں ذوقِ تخریب سے دُور دُور

دلوں میں رہے عزم تعمیر کا — جنوں ہو نہ پابند زنجیر کا

حدودِ مکان و زماں توڑ کر
نکل چل طلسمِ جہاں توڑ کر

غزل

از جناب زبیر احمد راہی صاحب قاسمی فاضل دیوبند

لوگ دلدادۂ انداز بتاں ملتے ہیں! — اب حقیقت کے پرستار کہاں ملتے ہیں

وحشتِ عشق کے آثار جہاں ملتے ہیں! — بس وہیں منزلِ جاناں کے نشاں ملتے ہیں

شیخ رندوں کو جو کہتا ہے برا کہنے دو! — ایسے "ناعاقبت اندیش" کہاں ملتے ہیں!

"شعلۂ طور" بجھا "شورِ انا" ختم ہوا — اب کے عشق کے اسرار نہاں ملتے ہیں؟

لوگ خنداں ہیں تو کیا، لوگ غزل خواں ہیں تو کیا؟ — غم کے آثار تو چہروں پہ عیاں ملتے ہیں!!

اسقدر گردشِ دوراں سے نہ گھبرا اے دوست! — زیست ملتی ہے تو آزارِ جہاں ملتے ہیں

کیا غضب ہو کوئی بندہ نہیں ملتا یارب! — جتنے ملتے ہیں "خداوند جہاں" ملتے ہیں

راہ میں نقشِ قدم ڈھونڈنے والے راہی
نقشِ پا ان کے سرِ کاہکشاں ملتے ہیں!

مطبوعات جدیدہ

اسلامی ہند کی عظمتِ رفتہ:- مرتبہ مولانا قاضی اطہر صاحب مبارکپوری، تقطیع کلاں کاغذ عمدہ، کتابت وطباعت بہتر، صفحات ۴۴۲، قیمت مجلد پتہ ندوۃ المصنفین اردو بازار، جامع مسجد، دہلی ۶

یہ کتاب فاضل مصنف کے آٹھ علمی وتحقیقی مضامین کا مجموعہ اور ہندوستان کی قدیم اسلامی تاریخ اور عرب ہند کے تعلقات کے بعض پہلوؤں سے متعلق ہے، سب مضامین معارف میں چھپ چکے ہیں، شروع کے تین مضامین میں اولین فاتحین ہند وسندھ عثمان، حکم، مغیرہ، محمد ابن قاسم اور ان کے بیٹے عمرو کے حالات، علمی ودینی کمالات، فوجی کارنامے اور ہندوستانی فتوحات کی روداد تحریر کی گئی ہے، اس ضمن میں قبیلہ بنو ثقیف اور طائف کی اسلامی اور جاہلی عہدوں کی مفصل تاریخ بھی آگئی ہے، دو مضامین میں ہندوستان آنے والے دو بصری علمائے تابعین کا مفصل تذکرہ ہے، ایک مضمون جو عرب وہند کے قدیم دینی، علمی اور ثقافتی روابط پر مشتمل ہے، قاضی رشید بن زبیر کی کتاب الذخائر والتحف کی تلخیص ہے، عرب مورخین اور سیاحوں نے جن قدیم ہندو راجاؤں کا ذکر کیا ہے آخری مضمون ان کی وضاحت وتحقیق پر مشتمل ہے، شروع میں قدیم اسلامی ہند پر لکھی جانے والی کتابوں کا مختصر تعارف کرایا گیا ہے، یہ کتاب بڑی محنت وتحقیق سے لکھی گئی ہے لیکن بعض جگہ عربی عبارتوں کے ترجمے میں بے احتیاطی کی وجہ سے غلطیاں ہوگئی ہیں، جیسے صفحہ ۵، پر حضرت عمرؓ کے قول ان لو اصیبوا الخ کا یہ ترجمہ "اگر مسلمانوں

کا نقصان ہوا تو میں تمہاری قوم سے ایک ایک کا بدلہ لوں گا" صحیح نہیں ہے، کیونکہ حضرت عمرؓ نے یہ بات اسلامی فوج کے کامیاب واپس آنے کے بعد کہی تھی، اس لیے صحیح ترجمہ یوں ہوگا کہ "اگر مسلمانوں کا نقصان ہوا ہوتا تو میں تمہاری قوم سے اس کا بدلہ لیتا"۔ ص ۱۱۹ پر اشعار کا ترجمہ صحیح نہیں کیا گیا ہے" لوطئت۔ اناث اعدت للوغی وذکور" کا یہ ترجمہ کہ "میں میدان جنگ کو شب عروسی بنا دیتا" غلط ہے، صحیح یہ ہوگا کہ "جو مرد اور عورتیں جنگ کے لیے مہیا کی گئی تھیں وہ پامال کر دی گئی ہوتیں"۔ اسی طرح بعد کے تین مصرعوں کے ترجمے میں اس لیے غلطی ہوگئی ہے کہ ان کو پہلے مصرعہ کے "لو" کا جواب نہیں مانا گیا ہے، ص ۱۴۴ پر لکھا گیا ہے کہ "معلوم نہیں کس تصریح یا قول کی بنا پر صاحب تحفۃ الاحوذی نے ان (ربیع بن صبیح) کو سوءِ حفظ یعنی حافظ کی خرابی سے منسوب کیا ہے، حالانکہ اس کی تائید کسی امام جرح وتعدیل کے قول سے نہیں ہوتی"۔ مگر تحفۃ الاحوذی کی جو عبارت ص ۱۴۳ پر نقل کر کے یہ تنقید کی گئی ہے وہ بعینہ تقریب التہذیب لابن حجرؒ میں بھی موجود ہے۔ راجہ رہمی کے متعلق قاضی صاحب کی تحقیقات گنجلک ہوگئی ہیں، ص ۱۱۰ پر "دستاویز" کو مذکر استعمال کیا گیا ہے، حالانکہ یہ مونث ہے، مصنفین اور کتابوں کے ناموں کے سلسلے میں کئی جگہ کتابت وطباعت کی غلطیاں نظر آئیں، مگر ان فروگذاشتوں سے قطع نظر یہ کتاب مستند اور اصحاب علم کے مطالعہ کے لائق ہے۔ غالباً محمد بن قاسم پر ابھی تک اس قدر مفصل کوئی تحریر نہیں لکھی گئی تھی۔

تین تذکرے:- ملخصہ جناب نثار احمد فاروقی صاحب، متوسط تقطیع، کاغذ کتابت وطباعت اچھی، صفحات ۳۴۴، مجلد قیمت عہ، پتہ مکتبۂ برہان، اردو بازار، دہلی ۶

زیر نظر کتاب میں تین قدیم اور اہم تذکروں مجمع الانتخاب (شاہ محمد کمال الہ آبادی) طبقات الشعراء (قدرت اللہ شوق بریلوی) اور گل رعنا (لچھمی نراین شفیق اورنگ آبادی)

کی بالترتیب تلخیص شائع کی گئی ہے، ان کی زبان اگرچہ فارسی ہے لیکن آخر الذکر کے سوا سب اردو شعراء کے تذکرے ہیں، فاضل مرتب نے جو مخطوطات کی ترتیب و تحشیہ کا خصوصیت کے ساتھ تجربہ رکھتے ہیں، بڑی خوش سلیقگی اور محنت سے یہ تلخیص کی ہے اور وہی مواد درج کیا ہے، جو مطبوعہ تذکروں میں مذکور نہیں ملتا یا اختلاف کے ساتھ ملتا ہے، اس لیے اس تلخیص میں ان تذکروں کا مغز اور جوہر آگیا ہے، انھوں نے اس تلخیص میں ان نسخوں کو بنیاد بنایا ہے جو انکے مولفین کی نظر سے گذر چکے تھے، اور دوسرے نسخوں سے مقابلہ و تصحیح بھی کی ہے، شروع میں ایک مبسوط مقدمہ ہے جس میں تینوں تذکروں اور ان کے مولفین کے متعلق ضروری معلومات جمع کیے گئے ہیں، حواشی بھی مفید ہیں یہ تذکرے اردو زبان و ادب کی تاریخ میں بڑے اہم اور بنیادی ماخذ کی حیثیت رکھتے ہیں، اور ابھی تک کمیاب اور غیر مطبوعہ تھے، ان میں مجمع الانتخاب اور گل رعنا بہت ضخیم ہیں، لیکن طبقات الشعرا کی ضخامت زیادہ نہیں ہے، غالباً اسی لیے کچھ عرصہ پہلے خود لائق مرتب نے اس کا مکمل متن اڈیٹ کرکے شائع کیا تھا، اس لیے اس کی تلخیص کی چنداں ضرورت نہ تھی، بہرحال اس مفید ادبی و تحقیقی خدمت کے لیے وہ اردو زبان و ادب کے طلبہ کے شکریے کے مستحق ہیں،

النبی الامی :۔ ترجمہ جناب مولوی مختار احمد صاحب سلفی ندوی خطیب جامع مسجد اہلحدیث مومن پورہ بمبئی، متوسط تقطیع، کاغذ، کتابت و طباعت بہتر، صفحات ۴۲، قیمت تحریر نہیں پتے: (۱) مکتبہ دینیہ مومن پورہ بمبئی ۱۱ (۲) مرکزی دار العلوم پوسٹ بکس نمبر ۱۹ وارانسی۔

یہ شیخ احمد بن حجر قاضی محکمہ شرعیہ قطر کی تصنیف "الرد الشافی الوافر علی من نفی امیۃ سید الاوائل والاواخر" کا سلیس اردو ترجمہ ہے، اس میں پہلے آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم کی مختصر سوانح عمری بیان کی گئی ہے، پھر تفصیل سے آپ کا امی (ناخواندہ) ہونا ثابت کیا گیا ہے، اس سلسلہ میں اہل لغت

اور علمائے تفسیر کے اقوال نقل کرکے آپکو خواندہ قرار دینے والوں کی تردید کی گئی ہے، یہ کتاب ایک مشہور حیدرآبادی فاضل کے ایک مقالہ کے جواب میں لکھی گئی ہے، اس لیے کہیں کہیں مناظرانہ رنگ آگیا ہے، جب قرآن مجید نے رسول اللہ صلعم کو امی اور آپ کی قوم کو امیین کہا ہے، تو کوئی مسلمان بھی اس کا منکر نہیں ہو سکتا، البتہ اس کے معنی میں اختلاف کی گنجائش ہے، گو عام طور سے اس کے وہی معنی لیے گئے ہیں، جو مصنف نے بیان کیا ہے، لیکن دوسرے معنی یہ ہیں کہ آپ کی قوم کو اہل کتاب کے مقابلہ میں امیین کہا گیا ہے، کیونکہ حضرت اسماعیلؑ کے بعد ان کے اندر کوئی نبی نہیں آیا اور نہ کتاب اتاری گئی، ترجمان القرآن حضرت عبد اللہ بن عباسؓ اور بعض دوسرے اہل علم نے اس کے یہی معنی لیے ہیں، اور یہی توجیہ صحیح ہے، اس لیے رسول اللہ صلعم چاہے پڑھے لکھے نہ رہے ہوں لیکن امی کے لفظ سے اس پر استدلال کرنا صحیح نہیں ہے، مصنف نے لغویین کے حوالہ سے اس کے جو معنی لکھے ہیں وہ لفظی نہیں بلکہ تشریحی معنی ہیں،

جامعہ جشن زریں نمبر :۔ مرتبہ جناب ضیاء الحسن صاحب فاروقی، متوسط تقطیع کاغذ، کتابت و طباعت عمدہ، صفحات ۲۰۰، قیمت عہ/ پتہ رسالہ جامعہ، جامعہ نگر، نئی دہلی۔

اکتوبر ۱۹۷۰ء میں جامعہ ملیہ اسلامیہ کے جشن زریں کے موقع پر اس کے ترجمان ماہنامہ جامعہ نے یہ خاص نمبر شائع کیا تھا، جو اس کی گذشتہ خدمات، موجودہ کوائف اور آیندہ کے بعض پروگرام اور منصوبوں کا مرقع ہے، اس کا پہلا حصہ خصوصیت سے لائق مطالعہ ہے، اس میں جامعہ کے قیام کا پس منظر، اس کے مقاصد، گذشتہ نصف صدی میں اس پر بیتنے والے نرم و گرم واقعات بیان کیے گئے ہیں، اور جشن سیمیں کے موقع پر اس وقت کے شیخ الجامعہ ڈاکٹر ذاکر حسین مرحوم اور موجودہ جشن زریں کے موقع پر اس وقت کے شیخ الجامعہ پروفیسر مجیب صاحب کے خطبے اور ایک قدیم جامعی رانا جنگ بہادر سنگھ کا دلچسپ مضمون

اور مختلف شعبوں کا جائزہ شامل ہے، باقی حصوں میں جامعہ سے متعلقہ موجودہ اداروں اور اس کے مرحوم امراء و شیوخ اور بعض مشہور اساتذہ کا مختصر تذکرہ کیا گیا ہے، یہ نمبر بڑی خوش مذاقی سے مرتب کیا گیا ہے، جو جامعہ سے متعلق جامع اور معلومات افزا ہے، لیکن شیخ الہند مولانا محمود الحسنؒ پر مضمون نہ ہونے کی کمی محسوس ہوتی ہے، نمبر کے خاتمہ پر روش صدیقی مرحوم کی جو اس تقریب کے وقت زندہ تھے، ایک موثر نظم درج ہے، اس کے آخری مصرعہ پر یہ تعارف ختم کیا جاتا ہے، ع

کاش اس آگ سے ہو شعلۂ ایماں پیدا

دیوان شاکر:۔ مرتبہ جناب نذر صابری و رفیق بخاری صاحبان تقطیع خورد، کاغذ، کتابت وطباعت اچھی، صفحات ۱۲۶، قیمت ۳ے، پتہ، مجلس نوادرات علمیہ، اٹک، کیمبلپور

یہ اٹک (ضلع کیمبلپور، پاکستان) کے بارہویں صدی ہجری کے ایک شاعر شاکر کے کلام کا مجموعہ ہے، انھوں نے اس زمانہ کے دستور کے مطابق فارسی زبان کو اظہار خیالات کا وسیلہ بنایا ہے، اور عربی اور اردو میں بھی داد سخن دی ہے، اس میں اردو کی دو غزلیں شامل ہیں، شاکر نے مختلف اصناف سخن میں طبع آزمائی کی ہے، غزلوں کا حصہ زیادہ ہے، شروع میں حمد، مناجات و منقبت اور آخر میں قطعات و رباعیات، مرثیے، مثنوی اور قصائد بھی ہیں، شاکر چونکہ صاحب دل شاعر تھے، اسلیے کلام میں عشق مجازی سے زیادہ عشق حقیقی کی گرمی اور مذہبی رنگ پایا جاتا ہے۔ اس مجموعہ سے ان کی قدرت کلام اور جوش بیان کا اندازہ ہوتا ہے، مگر احتیاط و عقیدت کی بنا پر پورا کلام بلا انتخاب شائع کیا گیا ہے جس میں پست و بلند ہر قسم کے شعر آگئے ہیں، ابتدا میں شاکر کے مختصر حالات اور خصوصیات کلام بھی تحریر کیے گئے ہیں، ایک گمنام شاعر کے کلام کی تلاش و جستجو اور اس کی اشاعت ایک ادبی خدمت ہے۔

'ض'

جلد ۱۰۸۔ ماہ جمادی الاخریٰ ۱۳۹۱ھ مطابق ماہ اگست ۱۹۷۱ء۔ عدد ۲

مضامین

مقالات

تلخیص وتبصرہ

ادبیات